Phone: 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1963ء

بتقریب سعید

عید میلاد النبیؐ

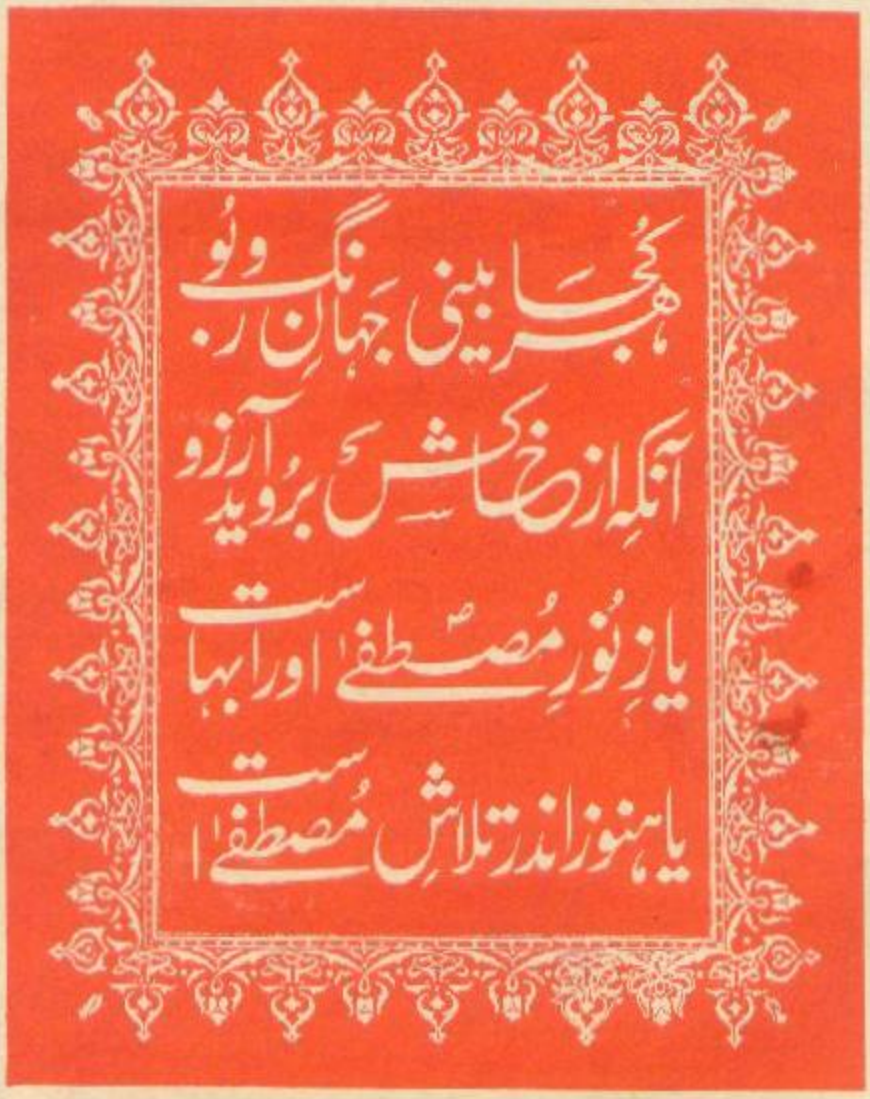

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

شائع کردہ:
ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلیفون نمبر (۸۰۰۸۰)	قیمت فی پرچہ	بدلِ اشتراک
خط و کتابت کا پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام	پاک و ہند سے	پاک و ہند سے سالانہ ۸ روپے
۲۵-بی- گلبرگ- لاہور	۷۵ نئے پیسے	غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ

فہرستِ مضامین

۱ — لمعات — (ہمارے علمائے کرام) — ۲

۲ — اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داریاں — (محترم پرویز صاحب) — ۱۷

۳ — شرفِ انسانیت کی صبحِ بہار — (صفدر سلیمی) — ۴۱

۴ — نقد و نظر — (۱) شاہ ولی اللہ کا تدبر فی القرآن (۲) حجاز کی مقدس سرزمین (۳) دراجات کیجئے — ۵۲

۵ — حقائق و عبر — ۵۳

۶ — کُونُوا رَبَّانِیِّین — (محترم عبدالرب صاحب) — ۵۹

۷ — رابطۂ باہمی — ۶۵

۸ — احتساب — ۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(ہمارے علمائے کرام)

مذہبی اجارہ داری کے سلسلے میں یہ بات بار بار دہرائی جاتی ہے کہ۔

جب آپ مکان بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کی بابت کسی انجینئر سے مشورہ کرتے ہیں جب آپ نے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں قانونی پوزیشن سمجھنی ہوتی ہے تو کسی وکیل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو کسی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب آپ نے مذہب کے متعلق کوئی بات پوچھنی ہو یا یہ دیکھنا ہو کہ فلاں قانون اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، تو اس کے لئے آپ کو علمائے کرام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اگر آپ یہ کام "مسٹروں" کے سپرد کردیں گے تو جو حشر آپ کا مکان بنوانے کے متعلق کسی اناڑی سے مشورہ لینے سے۔ بیماری کی صورت میں کسی حکائی سے علاج کرانے سے۔ یا مقدمہ کے سلسلے میں کسی منشی متصدی کی بات ماننے سے ہوگا وہی حشر آپ کا اس شکل میں بھی ہوگا۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں قانون سازی کا کام علماء ہی کے سپرد کرنا اور انہی کے فیصلہ کو سند اور حجت تسلیم کرنا چاہیئے۔

سطح بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو یہ بات بڑی معقول اور یہ دلیل بڑی محکم نظر آئے گی۔ آیئے ذرا اس مسئلہ پر گہری نظر سے غور کریں اور دیکھیں کہ یہ بات کہاں تک درست اور یہ دلیل کس حد تک معقول ہے!

انجینئروں، ڈاکٹروں اور وکیلوں کے متعلق سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کی تعلیم کے لئے حکومت نے قاعدے ضوابط مقرر کر رکھے ہیں۔ ان فنون کے لئے خاص یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کا خاص نصاب ہے۔ ان کالجوں میں داخلہ کے لئے بنیادی قابلیت اور صلاحیت کا معیار مقرر ہے۔ اس کے بعد خاص نظام کے ماتحت طلباء کے امتحانات ہوتے ہیں اور جو طلبا کامیاب ہوتے ہیں انہیں حکومت (QUALIFIED) تسلیم کرتی ہے۔ انہی سے متعلقہ امور میں مشورہ لیا جاتا ہے اور انہی کی بات کو سند (AUTHORITY) مانا جاتا ہے۔ جہاں تک "علماء" کا تعلق ہے ان کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی ایسا انتظام نہیں۔ لوگوں نے اپنے طور پر مکتب۔ مدرسے اور

دارالعلوم کھول رکھے ہیں جن میں طالب علموں کو مختلف کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور پھر انہیں با اپنے طور پر "سندِ فضیلت" دے دی جاتی ہے۔ یہ طالب العلم بعد میں علماء کہلانے لگ جاتے ہیں۔ (یہ "علماء" تو وہ ہیں جو ان دارالعلوموں کے سند یافتہ ہیں۔ ان کے علاوہ بیشتر علماء حضرات وہ بھی ہیں جنہوں نے کبھی کسی مکتب، مدرسہ، یا دارالعلوم کی شکل تک نہیں دیکھی لیکن مذہب اور شریعت کے معاملہ میں وہ بھی اپنے آپ کو سند سمجھتے" اور دوسروں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی رائے کو "خدا و رسول" کا ارشاد کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے متعلق تفصیل سے بات ذرا آگے چل کر کی جائے گی)۔

کہہ دیا جائے گا کہ سوال یہ نہیں کہ حکومت کسی کو مستند (QUALIFIED) تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟

دین کا علم ہونا ضروری ہے

سوال یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں لامحالہ انہی کی بات درست اور قابلِ قبول سمجھی جائے گی جنہیں مذہب کے متعلق علم حاصل ہو۔ اور چونکہ علماء حضرات کو مذہب اور شریعت کا علم حاصل ہوتا ہے اس لئے ان امور کے سلسلہ میں انہی کی طرف رجوع کرنا اور انہی کی بات کو سند تسلیم کرنا ہوگا۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ دین سے متعلق امور میں ان لوگوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جنہیں دین کا علم حاصل ہو۔ آیئے ہم دیکھیں کہ جن حضرات کو ان دارالعلوموں کی طرف سے سندِ فضیلت عطا ہوتی ہے انہیں دین کے متعلق کس قدر علم ہوتا ہے؟

مفتی عبدہٗ کی رائے

اس وقت تمام عالمِ اسلام کے مذہبی دارالعلوموں میں جامعہ ازہر (مصر) کو بلند ترین مقام حاصل ہے۔ اس یونیورسٹی کے علماء کے متعلق کسی مصری کی نہیں، علامہ مفتی محمد عبدہٗ جیسی بلند پایہ شخصیت کا فیصلہ سنئے جن کا ایک مدت تک خود اس یونیورسٹی کے بلند ترین ارکان میں شمار ہوتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

> جو شخص ازہر یا اس قبیل کے مدارس میں، جتنی زیادہ مدت تک تحصیل علم کرتا ہے، اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ (تفسیر المنار۔ جلد اول ص۱۸)

ان کے شاگرد رشید، علامہ رشید رضا مرحوم، اپنے استاد کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

> ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔

یہ ہے مفتی عبدہٗ کی رائے ان علمائے اسلام کے متعلق جن سے بڑھ کر مذہب کے معاملات میں کوئی اور سند نہیں ہو سکتی۔

دورِ حاضر میں، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی علمائے کرام کی جماعت میں جو پوزیشن تھی، اس سے

مولانا آزاد کی رائے

یہ تمام حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ "امام الہند" کہلاتے تھے۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں۔

مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اُمتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی جڑ دو ہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت، اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ سارے برگ و بار و ثمرات فساد کو انہی سے ظہور و نمود ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم، باسم اصل و اساس علومِ شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔ اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظرِ کیمیا وی ان کی تحلیل و تجزید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دینِ الخالص سے مرکب ہے۔ اور کس قدر اس فتنہ عالم آشوب یونانیت و عجمیت سے۔ کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتیٰ کہ علماً۔ علومِ الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیات اعمال و رسوم و ہیئاتِ معاشرت وغیرہ ذالک۔ جب یہ حال علومِ شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر و اوہام کا کیا پوچھنا جن کو بہ لقب شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے۔ (تذکرہ)

یہ ہیں وہ علوم جن کی تحصیل کے بعد ان مدارس اور دارالعلوموں میں "عالم" بن جانے کی سند ملتی ہے۔ اب ذرا ان درسگاہوں کا نصاب اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ وہ نصابِ تعلیم نہیں بلکہ چند قبریں ہیں جن میں سینکڑوں برس کی بوسیدہ اور متعفن ہڈیاں عقیدت و ارادت کے کفن میں لپٹی ہوئی رکھی ہیں۔ کوئی تین سال ادھر کا ذکر ہے

ان کا نصابِ تعلیم

اسلامیہ کالج لاہور کے سابق لیکچرر حافظ نذر محمد صاحب نے اپنے ایک مبسوط مقالہ میں اس نصاب کی تفاصیل بیان کی تھیں جو ہمارے دارالعلوموں میں رائج ہے اور جسے عام طور پر "درسِ نظامی" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان مدرسوں کا نصاب آٹھ سالہ ہے جس میں مندرجہ ذیل ۱۰ مضامین کی ۵۸ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔

مضمون	کتب	قدیم ترین کتاب کا سن تالیف	جدید ترین کتاب کا سن تالیف
۱۔ صرف	۶	۱۴۱۳ء	۱۸۶۰ء
۲۔ نحو	۶	۱۳۲۳ء	۱۷۷۶ء
۳۔ معانی و بیان	۳		
۴۔ عروض	۱		
۵۔ منطق	۱۲	۱۲۶۱ء	۱۸۲۸ء
۶۔ فلسفہ	۳	۱۴۳۷ء	۱۶۵۱ء
۷۔ علمِ کلام	۴		

مضمون	کتب	قدیم ترین کتاب کا سن تالیف	جدید ترین کتاب کا سن تالیف
۸۔ ادب عربی	۷		
۹۔ سیرت و تاریخ	۲		
۱۰۔ طب	۴	۱۰۳۵ھ	۱۰۵۵ھ
۱۱۔ ہیئت	۲		
۱۲۔ ہندسہ	۱	۱۲۷۴ھ	۱۲۷۴ھ
۱۳۔ مناظرہ	۱		
۱۴۔ فقہ (اصول فقہ)	۱۳	۱۰۳۶ھ	۱۰۵۵ھ
۱۵۔ تفسیر (اصول تفسیر)	۴	۱۳۱۶ھ	۱۵۰۵ھ
۱۶۔ حدیث (اصول حدیث)	۱۱		
۱۷۔ تجوید و قرأت	۵		

یہ سترہ مضامین کی قریب ساڑھے اٹھارہ ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی پچاسی کتابیں ہیں جنہیں رٹ لینے کے بعد ایک شخص مستند عالم دین بن جاتا ہے۔ آپ کو ان ۸۵ کتابوں میں قرآن کریم کا نام کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ قرآن ان کے نصاب میں ہے ہی نہیں۔ صرف سورۂ بقرہ آخری سال میں تبرکاً پڑھا دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں حافظ نذر محمد صاحب اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں۔

قرآن نصاب میں نہیں

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ تمام مضامین قرآن فہمی کے لئے پڑھائے جاتے ہیں تو پھر قرآن حکیم کب پڑھایا جاتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ چند مدارس کو چھوڑ کر کہیں بھی قرآن مجید کی مکمل تفسیر و تشریح کا انتظام نہیں۔ کتاب اللہ کے بغیر دینی تعلیم کی تکمیل کیونکر ہو جاتی ہے؟ بالیقین کہا جا سکتا ہے کہ دورِ حاضر کے فتنوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ منبع علم و عرفان، کتاب اللہ سے غفلت برتی جا رہی ہے خواہ وہ یونیورسٹی اور کالج میں ہو یا مسجد اور مدرسہ میں۔

دنیاوی علوم سے بے بہرہ

یہ تو ہوا ان علمائے کرام کا مبلغ علم دین کے سرچشمہ اور قوانین اسلامیہ کے منبع، کتاب اللہ کے متعلق۔ جہاں تک دنیاوی علوم کا تعلق ہے، حافظ صاحب اس باب میں لکھتے ہیں۔

دینی مدارس کے طلبا کا دنیا سے یکسر بے خبر ہونا حد درجہ افسوسناک ہے۔ وہ اکثر مسائل حاضرہ کو نہ سمجھتے ہیں نہ ان کے حل پیش کر سکتے ہیں انہیں تحریکات جدیدہ سے کوئی واقفیت نہیں۔ جدید

تقاضوں۔ نئے طرزِ فکر اور ضروریات کا انہیں کوئی علم نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کے نصاب اور مشمولہ کتابوں کی قدامت ہے۔

اس نصاب سے ذہنوں پر جس قدر جمود طاری ہو سکتا ہے، اس کے متعلق اسی زمرہ کے ایک فرد (بلکہ رکن رکین) سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، مغلوں کے زمانے میں ہندی مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ذہنی جمود

اس کے بعد ذہنی حیثیت سے ہم تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی سالوں سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علوم اوائل تک محدود تھا۔ ہمارے نظامِ تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرفِ آخر ہے۔ اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے رتبے چڑھائے جائیں .... اس کی وجہ سے ایک مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی فضا پر طاری ہو چکی تھی۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء)

یہ ہے وہ ذہنی جمود جس کے پیکر ہمارے علمائے کرام ہوتے ہیں (واضح رہے کہ مودودی صاحب نے جس وقت تک کا جائزہ اپنے تبصرہ میں لیا ہے اس کے بعد بھی ہمارے ان دینی مدرسوں میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ تغیر و تبدل تو ان کی شریعت کی رُو سے بدعت ہے اور ہر بدعت انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے۔

یہی مودودی صاحب، خود اپنے زمانے کے علمائے کرام کے متعلق لکھتے ہیں۔

"علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہارِ نفرت تو ان سے جتنا چاہیے کرا لیجیے لیکن اس زہر کا تریاق، بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔

(تنقیحات۔ صفحہ)

ترکوں کی حالت

انیسویں صدی میں ترکی کی حالت جس قدر خستہ و خراب ہو چکی تھی، اس میں علمائے کرام کا کس قدر حصہ تھا اس کے متعلق مودودی صاحب اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظام سلطنت کی اصلاح، علوم جدیدہ کی اشاعت، طرز جدید پر عسکری تنظیم، اور جدید مغربی آلات حرب کی ترویج شروع کی لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علمائے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے۔ مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لئے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ کو استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو، بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا وہ یورپ کے مقابلہ میں بالکل سینہ بہ سینہ کھڑے تھے اور برسرپیکار تھے مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی، تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے۔ اور خود ان کی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے بالکل عاری اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں۔ اور علماء و مشائخ نے پھر مخالفت کی۔ بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کر سکے مگر علماء اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے۔ سلطان بے دین ہو گیا ہے۔ اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لئے خرابیٔ ایمان کا موجب ہے۔ (ایضاً ص ۶۶-۶۷)

علماء کی کوتاہ بینی

جب ترکوں میں اپنی حالت بدلنے کے لئے، انقلابی روح بیدار ہوئی تو اسے کچلنے کے لئے علمائے کرام کس قسم کی تعلیم پیش کر رہے تھے اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشائخ

تھے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی، اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفۂ کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی حدیثیں سنا رہے تھے جن کو سُن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دُھنتے تھے مگر آج کل کے دماغ ان کو سُن کر صرف ان مفسرین و محدثین ہی سے نہیں بلکہ خود قرآن و حدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں۔ خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک ان قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنتِ رسولؐ میں مقرر کئے گئے ہیں۔

(ایضاً۔ صـ ـــ)

حالات کے اس تفصیلی جائزہ کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگا رہے ہیں مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علماء و مشائخ ہیں۔ انہی کے جمود نے ایک مجاہد قوم کو جو پانچ سو برس سے اسلام کے لئے تن تنہا سینہ سپر تھی اسلامیت سے فرنگیت کی طرف ڈھکیلا ہے اور اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جامدین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب ڈھکیل کر رہیں گے۔

(ایضاً صـ ـ)

اب یہی مودودی صاحب یہاں[؎] دن رات چلا رہے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور علمائے کرام کے ہاتھ میں دیدو۔ قانون سازی کے اختیارات انہی کے سپرد کردو۔ ہر معاملہ میں ان کے قول کو قولِ فیصل قرار دو۔ کیا اس کا مطلب صاف یہی نہیں کہ مودودی صاحب پاکستان کو بھی اسی تباہی کے گڑھے میں دھکیل دینے کے درپے ہیں جس میں ترکی کے علماء نے ترکی کو دھکیل دیا تھا؟ واضح رہے کہ ترکی کے علماء اور پاکستانی علماء میں، رتی برابر بھی فرق نہیں۔ جتنی خرابیاں ترکی کے علماء میں مودودی صاحب نے گنائی ہیں وہ سب پاکستانی علماء میں موجود ہیں اور مودودی صاحب خود اس کے معترف ہیں۔ غور سے سنئے وہ اپنی کتاب تفہیمات (حصہ دوم) میں "ان علمائے کرام کے متعلق رقمطراز ہیں۔

باستثناء چند اس طبقے کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔

؎ ہر جلوئی اپنے اور اپنے ہم نواؤں کے لئے اس قسم کی گنجائش رکھ لیتا ہے۔ (طلوع اسلام)

ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانئے کہ آپ کے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہو گی۔ اس لئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا متعصب ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں، پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لئے لا محالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہو گی اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جتھے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔ یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات جو ان مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہو گی۔ وہ ہر جمعہ کو رسول اللہ ﷺ کے منبر پر سے وہ وہ موضوع اور ضعیف روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکام اسلامی کی غلط تعبیریں سنیں گے کہ جن کو سن کر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

مذہبی دھڑے بندیوں کے علاوہ اب مسلمانوں میں سیاسی دھڑے بندیوں کا بھی زور ہو رہا ہے جہاں کہیں مولوی قسم کے لیڈروں یا لیڈر قسم کے مولویوں کو امامت و خطابت کا موقع مل گیا ہے وہاں وہ نہایت منہ پھٹ اور بے لگام طریقے سے اپنے سیاسی مسلک کی تائید اور مسلک مخالف کے لوگوں کی تذلیل و تضحیک و تفسیق کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ ایک اور فتنہ ہے جو اگر کچھ زیادہ بڑھ گیا تو مسلمانوں کے لئے مل کر نماز پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ مسجدوں میں وہ کچھ ہونے لگے گا جو پولنگ اسٹیشنوں پر ہوا کرتا ہے اور بالآخر ہر سیاسی مسلک کے لوگوں کی مسجدیں الگ ہو کر رہیں گی۔

یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) ان سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ

تفرقہ بازی

ان کا سرمایۂ نازِ علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو غیرت دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور تیز کرتی رہتی ہے۔ (تذکرہ)

مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ، بغداد کی تباہی ہے اس کے متعلق مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"تاتاریوں کو سب سے پہلے دعوت حنفیوں اور شافعیوں کے باہمی جھگڑوں نے دی تھی۔ نو مسلم حکمران مذہب

بغداد کی تباہی

علم سے نا آشنا تھے۔ اس لئے مذہبی حکومت تمام تر علماء و فقہائے مذاہب کے ہاتھ آگئی۔ ہر مذہب کے الگ الگ قاضی، الگ الگ مدارس، اوقاف، ائمہ جمعہ اور مذہبی عہدے قرار پا گئے۔ یہی چیز صدہا مفاسد مصائب کا باعث ہوئی۔ ایک طرف علمائے دنیا و فقہائے دولت کا ایک گروہ عظیم پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف باہمی تعصب و تفرقہ الگ روز بروز بڑھنے لگے۔ حتیٰ کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی کبھی اہمیت نہ دی تھی ان کی بنا پر اب خواص و فقہا ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے۔ (تذکرہ)

ہم پوچھتے ہیں ان حضرات سے جو مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان میں قانون سازی کے اختیارات علماء کے ہاتھ میں دے دئے جائیں۔ کہ کیا وہ یہاں بھی اس قسم کی تباہی لانا چاہتے ہیں جس قسم کی تباہی بغداد پر آئی تھی؟ یہاں کے علماء کے متعلق مولانا آزاد آگے چل کر لکھتے ہیں۔

علماء کا کردار

آج امت کا ایک فاسق سے فاسق گروہ بھی شاید کسی سچائی کی خاطر کچھ نقصان جان و مال اٹھائے اور اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے۔ لیکن مدعیانِ علم و مشیخت اور زہد فروشانِ سجادہ طریقت سے اتنی بھی امید نہیں .... گزشتہ دور میں جو بلائیں ہمارے سروں پر آئیں اسی جماعت کی بدبختی اور نحوست کی راہ سے آئیں۔ بادشاہوں کو یہی لوگ راہ راست سے ہٹا کر گمراہ کرتے تھے۔ بہتر طریقے جو گمراہی کے طریقے ہیں، جن لوگوں نے بھی اختیار کئے انہی لوگوں کی بدولت۔ (تذکرہ)

علمائے کرام کے متعلق یہ کوئی "مسٹر" نہیں کہہ رہا۔ خود انہی حضرات کا ایک جلیل القدر نمائندہ کہہ رہا ہے۔ اسی کی زبان سے کچھ اور بھی سنئے۔ وہ (مولانا آزاد) لکھتے ہیں۔

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یک جا اکٹھے نہ ہوں گے کتوں کا مجمع دیکھئے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے ..... فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جام تندرستی پیتے ہیں اور چور ڈاکو مل جل کر راہ زنی کرتے ہیں مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرنا پھاڑنا اور پنجے مارنا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیالہ و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھنا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے احبار یہود سے فرمایا تھا "تم نے داؤدؑ کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ

بنا دیا ہے۔ ڈاکوؤں کے بہت سا حال تو معلوم نہیں لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔" (تذکرہ صفحہ ۸۳-۸۴)

اس کی تائید مودودی صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

پھر جو لوگ مسلمانوں کی راہ نمائی کے لئے اٹھتے ہیں ان کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے۔ کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں ظاہر میں خدمت دین، باطن میں خیانتیں۔ غداریاں۔ نفسانی اغراض کی بندگیاں۔

(سیاسی کشمکش حصہ اول صفحہ ۵۵۔ بحوالہ جماعت اسلامی کا رخ کردار صفحہ ۲۶۳)

یہ ہے مختصر الفاظ میں اس علم کی حقیقت جسے حاصل کرنے کے بعد یہ حضرات اپنے آپ کو عالم دین کہہ کر پکارتے ہیں اور یہ ہیں وہ علمائے عظام کہ جن کی بنیاد پر یہ علمائے بنی اسرائیل کی مثل (کانبیاء بنی اسرائیل) ہونے کا دعوے کرتے ہیں۔

ہم نے ان حضرات کے علم اور عمل کے متعلق اپنی طرف سے ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ خود انہی کے دو نامور نمائندگان ــــ مولانا ابو الکلام آزاد (مرحوم) اور سید ابو الاعلیٰ مودودی کے تاثرات کو پیش کر دیا ہے۔ مولانا آزاد تو آج ہم میں موجود نہیں۔ لیکن ہم مودودی صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہی ہے وہ علم جس کے حاملین کے سپرد آپ پاکستان کے قوانین سازی کے اختیارات کرنا چاہتے ہیں، اور کیا یہی ہے وہ کیریکٹر جس کی بنا پر آپ انہیں حکومت جیسی متاع عظیم کا امین بنانے کے لئے ہنگامے برپا کر رہے ہیں؟ "حضرات" کو دین کا علم نہیں۔ سوٹ پہننے والے سیرت و کردار سے عاری ہیں ــ بہت اچھا۔ لیکن

کیا ان کے سپرد اختیارات کیے جائیں

یہ فرمائیے کہ یہ جبہ و عمامہ (یا اچکن اور پاجامہ) بردار حضرات جن کے دینی علم اور کردار کے متعلق آپ خود یہ کچھ فرماتے ہیں اس قابل ہیں کہ یہ دین کے کسی معاملہ کے متعلق صحیح رائے دے سکیں اور ملت کی کوئی متاع ان کے سپرد کی جا سکے؟ یہ درست ہے کہ مکان بنوانے کے لئے کسی انجینیئر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ بیماری کے لئے کسی ڈاکٹر کا مشورہ لینا چاہیئے۔ مقدمہ کے سلسلہ میں کسی وکیل کے پاس جانا چاہیئے۔ اس لئے کہ انہیں اپنے اپنے فن کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دین کے معاملات کے متعلق ان علماء کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جن کے متعلق آپ خود کہہ رہے ہیں کہ "ان کے ہاں صدیوں سے کسی نئی فکر کسی نئی دریافت کا مشکل ہی سے پتہ چلتا ہے۔" (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۱ء)۔ جن کے مہمات مسائل خود آپ کے الفاظ میں یہ ہیں کہ

رسول اللہ کو علم غیب تھا یا نہیں۔ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ رسول کا نظیر ممکن ہے یا نہیں۔ ایصال ثواب اور زیارت قبور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آمین بالجہر یا رفع یدین کیا جائے یا نہیں۔

مسجد میں محراب و منبر کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے۔ (تنقیحات ص۵)

کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان سے پوچھا جائے کہ پاکستان کا معاشی نظام کیا ہونا چاہیئے اور اسے سیٹو اور سینٹو کا ممبر رہنا چاہیئے یا نہیں؟ ان کی عقل و فکر میں تو یہ بات بھی نہیں آسکتی کہ ان اصطلاحات کا مطلب کیا ہے اور کسی ملک کی کرنسی (CURRENCY) کا بین الاقوامی حالات سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے — اس کو کیا جانیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

(۴) یہاں تک ہم نے ان علماء کے علم و عمل کے متعلق گفتگو کی ہے جو کسی مدرسہ یا دارالعلوم کے سند یافتہ مولوی ہیں

غیر مستند علماء

لیکن بے شمار ایسے بھی ہیں جنہوں نے کسی مذہبی مکتب یا دارالعلوم کی شکل تک نہیں دیکھی اور وہ بھی حضرات علمائے کرام" کے زمرہ میں شامل ہیں۔ ان میں سرفہرست خود مولانا مودودی صاحب کا اسم گرامی آتا ہے۔ ان کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کسی مذہبی مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کی اور ان کے پاس نہ کسی کالج کی ڈگری ہے نہ کسی دارالعلوم کی سند اور اس کے باوجود وہ اس وقت مذہب کے معاملہ میں اپنے آپ کو سب سے بڑی سند سمجھتے ہیں۔ یہ بات ایک مودودی صاحب تک ہی محدود نہیں۔ جماعت اسلامی کے جتنے بڑے بڑے اکابرین دکھائی دیتے ہیں (جہاں تک ہمیں معلوم ہے) ان میں سے کسی نے بھی کسی مذہبی دارالعلوم میں تعلیم نہیں پائی اور اس کے باوجود وہ سب "عالم دین" ہیں اور ان کے ارشادات مذہب کے معاملہ میں سند و حجت سمجھے جاتے ہیں۔

اس سے کم از کم اتنا تو ثابت ہو گیا کہ خود ان حضرات کے نزدیک، عالم دین ہونے کے لئے کسی مذہبی مدرسہ یا دارالعلوم میں تعلیم پانا ضروری نہیں۔ یہ علم اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ ان کے نزدیک مذہبی مدارس میں تعلیم حاصل کئے بغیر انسان، دین کا علم حاصل کر سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ ان کے مقابلہ میں دیگر علماء دین کی صحیح روح سے بیگانہ ہیں۔ چنانچہ مودودی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ان پڑھ عوام ہوں یا دستار بند (علماء) یا فرق پوش مشائخ" یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات، ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں۔ مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں سب یکساں ہیں۔

(تفہیمات حصہ اول ص۳۸)

جو لوگ جماعت اسلامی کے مخالف ہیں ان کے متعلق ارشاد ہے۔

مذہبی سوداگر

ان سے بہت مختلف کچھ دوسرے مذہبی سوداگر بھی موجود ہیں جن کے لئے سب سے بڑا مسئلہ اپنی گدیوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی ریاستوں کی حفاظت کا ہے۔ ان

میں سے ہر ایک نے جن اسامیوں اور گاہکوں کو اگلوں سے میراث میں پایا ہے یا خود اپنی محنت سے فراہم کیا ہے ان کو وہ ہر قیمت پر اپنے کاروبار سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اقامت دین کی کسی ہمہ گیر تحریک کو خواہ وہ کیسی ہی صحیح بنیادوں پر اٹھی ہو اور کتنی ہی سلامت روی پر چلائی جا رہی ہو اور خود ان کا علم و ضمیر اس کے برحق ہونے کی شہادت دے رہا ہو، برداشت کرنا ان کے لئے مشکل ہوتا ہے کیونکہ اسے دیکھتے ہی فوراً انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں ان کے یہ حلقے ٹوٹ کر اس بڑے دائرے میں جذب نہ ہو جائیں۔ (جماعت اسلامی ۵۱ء-۱۹۵۰ء۔ بحوالہ جماعت اسلامی کا رخ و کردار۔ صفحہ ۲۶۳)

ان کے اختلافات

اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان حضرات کے نزدیک جنہوں نے کسی مذہبی مدرسہ میں تعلیم حاصل نہیں کی، ان لوگوں کو نہ دین کی روح کی کچھ واقفیت ہے نہ ہی ان کا کوئی کیریکٹر ہے جو اگرچہ مذہبی دارالعلوم کے سند یافتہ ہیں لیکن جماعت اسلامی کے مخالف ہیں۔ دوسری طرف یہ علماء حضرات جماعت اسلامی کو اسلام کا بدترین دشمن قرار دیتے ہیں۔ ان پر کفر کے فتوے لگ چکے ہیں۔ وہ مودودی صاحب کو دین کے علم سے بے بہرہ سمجھتے ہیں۔ مولانا غلام غوث ہزاروی انہیں "مولانا مودودی" کبھی نہیں کہتے "منشی مودودی" کہہ کر پکارتے ہیں۔ ان کی باہمی جنگ مسلسل جاری ہے۔ علاوہ بریں خود مستند علماء کے مختلف فرقے ایک دوسرے پر کفر کے فتاویٰ لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی باہمی لڑائیاں کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ ان اختلافات کی بنا پر مساجد میں قتل تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ یہ حضرات آج تک ان باتوں کا بھی فیصلہ نہیں کر پائے کہ دین حقہ کی رو سے نماز میں ہاتھ باندھنے چاہئیں یا کھلے چھوڑنے چاہئیں۔ اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس جگہ؟ امام کے پیچھے الحمد پڑھنی چاہیئے یا نہیں۔ الحمد کے بعد آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیئے یا خاموشی سے۔ بیوی کو ایک نشست میں "تین طلاق" دے دینا شریعت کے مطابق ہے یا تین مجالس میں، تین طہر کے ساتھ۔

ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ۔

(۱) جب آپ کہتے ہیں کہ قانون سازی کے اختیارات علماء حضرات کے سپرد کر دینے چاہئیں تو اس سے آپ کی مراد اپنی جماعت یا اپنے فرقہ کے علماء سے ہوتی ہے یا دوسرے فرقوں کے علماء سے بھی؟

(۲) اگر کسی معاملہ کے متعلق دوسرے فرقوں کے علماء کوئی رائے دیں اور وہ رائے آپ کے مسلک کے خلاف ہو تو کیا آپ اسے شریعت کا صحیح فیصلہ تسلیم کر لیں گے؟

(۳) کیا یہ ممکن ہے کہ شیعہ۔ اہل حدیث۔ دیوبندی۔ بریلوی اور جماعت اسلامی کے علماء ایک جگہ بٹھائے جائیں اور وہ مملکت کے لئے ایسے قوانین مرتب کر دیں جنہیں تمام مسلمان یکساں طور پر اسلامی قوانین تسلیم کر لیں؟

ہمارے نزدیک علماء حضرات کے اس مطالبہ کا مؤثر جواب یہ تھا کہ حکومت ایک بورڈ بنا دیتی جس میں ان تمام فرقوں کے علماء شامل ہوتے اور ان کے سپرد چند ایک معاملات کر کے ان سے کہہ دیتی کہ وہ ان کے متعلق متفق علیہ قوانین مرتب کر دیں ——— اس کے لئے مدت کا تعین ضرور کر دیا جاتا ——— ساری بات واضح ہو جاتی۔ ہم حکومت سے استدعا کریں گے کہ وہ اب بھی ایسا کر دے تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔

اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوگا اور وہ یہ کہ جب ان لوگوں میں باہمی اختلافات اس قدر ہیں تو وہ کون سی بات ہے جو ان میں قدر مشترک ہے۔ اور جس کی بناء پر یہ سب 'اپنے آپ کو "غیروں" کے مقابلہ میں ایک جمعیت کے افراد کی حیثیت سے سامنے لاتے ہیں۔ آپ پوری طرح تجزیہ کر لیجئے آپ کو ان میں صرف ایک قدر مشترک نظر آئے گی اور وہ یہ کہ

یہ معاشی مسئلہ ہے

ان سب کا ذریعۂ معاش مذہب ہے۔ اور یہی چیز ان میں وجۂ جامعیت ہے۔ ان کا مسئلہ دینی نہیں معاشی ہے اسی لئے مودودی صاحب نے انہیں "مذہبی سوداگر" کہا ہے۔ وہ خود بھی ملک التجار ہیں۔

———— . ————

ان حضرات کی طرف سے بڑی نفرت اور طنز کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ "یہ ڈاڑھی منڈے دین کا علم کیا جانیں"؟

ڈاڑھی کا مسئلہ

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاڑھی کے بغیر دین کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں ہم مودودی صاحب سے ایک ذاتی سوال پوچھنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ پنجاب میں آنے سے پہلے وہ ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انہیں اس وقت بھی دین کا وہ علم حاصل تھا جو اب حاصل ہے۔ یا یہ علم ڈاڑھی رکھنے کے ساتھ آیا ہے؟ معاف فرمائیے۔ ہمیں نہ تو ڈاڑھی کا استخفاف مقصود ہے اور نہ ہی ہم ذاتیات میں الجھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ ایک اصولی سوال ہے کہ کیا دین کا علم ہونے کے لئے ڈاڑھی والا ہونا ضروری ہے؟ ہم اس بات کی وضاحت یوں بھی کر سکتے تھے کہ علامہ اقبالؒ ڈاڑھی نہ رکھنے کے باوجود دین کے اتنے بڑے عالم تھے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ بات ان حضرات کے لئے دلیل نہیں قرار پا سکتی کیونکہ ان کے نزدیک "اقبالؒ" بچارے کا دینی علم کچھ ایسا ویسا ہی تھا اسی بنا پر ہم نے یہ سوال خود مودودی صاحب کے متعلق دریافت کیا ہے؟ ہمیں امید ہے کہ مودودی صاحب یہ نہیں کہیں گے کہ جب وہ ڈاڑھی منڈاتے تھے تو دین کے علم سے کورے تھے اور یہ علم ڈاڑھی کے ساتھ آنا شروع ہوا۔

———— - ————

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ

(۱) دین کا عالم ہونے کے لئے نہ تو یہ شرط ہے کہ اس شخص نے کسی مذہبی مدرسہ یا دار العلوم میں تعلیم حاصل کی ہو۔

(۲) اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ اس کی شکل و شباہت مولویانہ ہو۔

(۳) دین کا علم اپنے گھر پر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس کے لئے کسی خاص وضع قطع یا شکل و شباہت کی شرط نہیں۔

لہٰذا جب یہ کہا جائے گا کہ دین کے معاملات کے متعلق ایسے لوگوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو دین کے علم سے واقف ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کے لئے مولوی صاحبان کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ دین کا علم کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں۔ اسے ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ جن حضرات کو "علماء کرام" کہا جاتا ہے نہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق دین کا علم تو ایک طرف اس کی روح تک سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اسی نتیجہ پر علامہ اقبالؒ پہنچے تھے۔ جب کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ

یہ اجارہ داری نہیں

حقیقت را بہ رندے فاش کردند — کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

اور اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ یہ تمام علماء حضرات (باستثنائے چند) اُس تحریک پاکستان کے مخالف تھے جو دین کی عمارت کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس تحریک کا تصور دیا تو اس (اقبالؒ) نے جو داڑھی منڈاتا تھا۔ سوٹ پہنتا تھا اور کسی مذہبی دارالعلوم کا تعلیم یافتہ نہیں تھا اور اقبالؒ کی اس بات کو سمجھا تو وہ شخص (قائداعظمؒ) جو اقبالؒ ہی کی طرح "داڑھی منڈاتا تھا۔ سوٹ پہنتا تھا اور کسی مذہبی مدرسہ کا تعلیم یافتہ نہیں تھا اور اب بھی آپ دیکھیں گے کہ اس مملکت کو بھی دین کی منزل کی طرف وہی لوگ لے جائیں گے جن کا "مصطلحہ علمائے کرام" کے طبقہ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا لیکن انہیں دین کا علم حاصل ہوگا۔ ان علمائے کرام کا وجود اُس وقت بھی تحریک پاکستان کی راہ میں سب سے بڑا روڑا تھا اور آج بھی پاکستان میں ان کا وجود اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ خواہ یہ دارالعلوموں کے ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہوں یا اپنے ہاں بیٹھے بٹھائے عالم بن گئے ہوں۔ مولانا آزادؒ کے الفاظ میں

گزشتہ دور میں جو بلائیں ہمارے سروں پر آئیں اسی جماعت کی بدبختی اور نحوست کی راہ سے آئیں۔

اور اب بھی جو مصیبتیں آ رہی ہیں انہی کے تصدق میں آ رہی ہیں۔

چارہ مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و مُلّا و پیر (اقبالؒ)

خدا پاکستان کو ان آفات سے نجات دلائے تاکہ انسانیت سکھ کا سانس لے سکے۔

پٹ سن کی مصنوعات تیار کرنے والوں میں

★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ

ڈھاکہ

اس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے، بوریاں، سوتلیاں اور ٹاٹ کی دیگر اشیاء وکینواس دنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جا رہے ہیں اور دنیا کے ہر حصہ میں ویسے ہی مقبول عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

مینجنگ ایجنٹس

احمد برادرز لمیٹڈ ـ ۳۵-۳۶ جناح ایوینو

رمنا ـ ڈھاکہ - ۲

تار کا پتہ "باوانی" ـــــــ فون نمبر ۶۷۳۱-۲

کراچی آفس ـــــــ بینک ہاؤس، حبیب اسکوائر، بندر روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نذرِ عقیدت بحضورِ شہنشاہِ بوریا نشین (علیہ التحیۃ والسلام)

اسلامی مملکت کے سربراہ

کی

معاشی ذمہ داریاں

(تقریر بتقریب سعید جشن عید میلاد النبیؐ)

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں

برادرانِ عزیز! سلام و رحمت۔

یہ امر موجبِ ہزار برکات و مسرت ہے کہ ہم آج کی تقریب سعید اس ذاتِ اقدس و اعظم کی حسین و شاداب یاد میں منا رہے ہیں جسے خود خدائے تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین قرار دیا ہے اور جس کے متعلق یہ کہہ کر اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ اس آفتابِ جہاں تاب کو، شرف و تکریم انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر جلوہ بار دکھایا ہے۔ میں اپنی اس خوش بختی اور فیروز مندی پر جس قدر بھی فخر و ناز کروں کم ہے کہ مجھے اس بارگاہ رسالت مآبؐ میں نذرِ عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جس پر خدا اور اس کے فرشتے تبریک و تہنیت کے پھول برساتے اور نوامیسِ فطرت جس کی حمد و ستائش کے گیت گاتے ہیں۔

وہ مایۂ خلقتِ ہستی وہ معنیٔ کونین — وہ جانِ حسنِ ازل۔ وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کنجِ حرا — وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں، وہ محمدؐ عربی — بروحِ اعظم دپاکش درود لامحدود

عزیزانِ من!

تمہید

اللہ تعالیٰ نے انسانی راہ نمائی کے لئے تعلیم بھیجی، تو اس کے ساتھ اپنے رسولوں کو بھی بھیجا۔ رسول کا کام اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ڈاکیہ کی طرح، خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیتا اور بس۔ اگر مقصود صرف خدا کی کتاب کو انسانوں تک پہنچا دینا ہوتا تو خدا آسمان سے لکھی لکھائی کتاب کیوں نہ نازل کر دیتا؟ کتاب کے ساتھ رسول کے بھیجنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ رسول اس کتاب کی تعلیم کو عملاً جاری کر کے یہ دکھائے کہ وہ تعلیم محض نظری حقائق کا مجموعہ یا ناممکن العمل اصولوں کا مرقع نہیں۔ وہ ایک ایسا قالب ہے جس میں انسانی معاشرہ ڈھلنا ہے۔ خدا کی طرف سے یہ راہ نمائی اپنی آخری اور مکمل شکل میں حضورؐ نبی اکرم کی وساطت سے قرآن کریم میں دی گئی۔ آپؐ نے اس آسمانی تعلیم کے مطابق ایک مملکت قائم کی جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ جب انسانی معاشرہ کی تشکیل وحی کی

روشنی میں کی جاتی ہے تو وہ کس طرح نوعِ انسان کے لئے صد ہزار برکات وسعادت کا موجب بن جاتا ہے لیکن اس مملکت کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ اس کا سربراہ خود اپنی سیرت وکردار کو قرآن کے قالب میں ڈھالے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اپنی سیرت کو قرآن کے پیکر میں ڈھالتا ہے اور مملکت اس کے حسنِ سیرت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے جس مملکت کی بنیاد حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں نے رکھی اور جسے آپ کے سچے جانشینوںؓ نے پروان چڑھایا۔ ظاہر ہے کہ اس کے متعدد گوشے تھے اور ان گوشوں میں سے ہر ایک میں اس مملکت کے سربراہ کی سیرت، جھلمل جھلمل کرتی نظر آتی تھی۔ یہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کہ میں اس مملکت کے تمام گوشوں کو ایک نشست میں آپ کے سامنے لاسکوں۔ اس لئے میں اس وقت اس کے صرف ایک گوشے کی نقاب کشائی کروں گا۔ اس سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ اس مملکت کے سربراہوں۔ یعنی نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوں۔ کی عملی مثال نے اس گوشے کو کس طرح تاریخِ انسانیت کا درخشندہ باب بنا دیا تھا اور آنے والوں کو بتا دیا تھا کہ جس مملکت کو نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت بننا ہو اس کے سربراہ کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ واللہ المستعان۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔

انسانی عجز کا اعتراف

عصرِ حاضر کا ایک ماہرِ سیاسیات پروفیسر مینکن (H. L. MENCKEN) دنیا کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لینے کے بعد بصد حسرت ویاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ــــ

> تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما ہیں لیکن جب ان کے عملی نفاذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت ویاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں لیکن جب حکومت کو عملاً قائم کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد عوام کی خدمت کے بجائے انہیں لوٹنا کھسوٹنا ہو جاتا ہے
>
> (TREATISE ON RIGHT AND WRONG)

اس مؤرخ نے بیشک اقوامِ عالم کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن نظر آتا ہے کہ تاریخ کا ایک باب یا تو اس کی نگاہوں سے اوجھل رہا اور یا اس نے اسے عمداً نظر انداز کر دیا۔ اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ باب ایک غیر جانبدار مؤرخ کے سامنے آئے اور وہ انسان کی اس کامیابی کا تذکرہ نہ کرے جس کی رو سے اس نے دنیا کو بتا دیا کہ ایک ایسا نظام قائم کیا جاسکتا ہے جس میں حکومت کا فریضہ عوام کے خدا کی حیثیت سے ان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہو اور یہ فریضہ

ایک استشہاد

محض نظری طور پر اس کے سامنے نہ ہو بلکہ وہ حکومت اسے عملاً پورا کر کے دکھا دے۔ یہ نظام قائم ہوا تھا آج سے قریب چودہ سو سال پہلے، محمد رسول اللہ والذین معہ کے انسانیت ساز ہاتھوں سے جس سے دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ انسان اگر وحی کی راہنمائی میں اپنا معاشرہ متشکل کرے تو کس طرح اس کی ناکامیاں، کامیابیوں میں بدل جاتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے۔ اس نظام کے متعدد گوشے ہیں جن میں سے ہر گوشہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ جو حکومت مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اس کا ہر قدم کس طرح تعمیر انسانیت کے لئے اٹھتا ہے۔ لیکن چونکہ پروفیسر جیکسن نے ان میں سے سب سے زیادہ اہمیت اس گوشے کو دی ہے جس کا تعلق عوام کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے سے ہے، اس لئے میں آج کی تقریبِ سعید پر اس گوشے کی ایک ہلکی سی جھلک آپ احباب کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آ جائے گی کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں، اور انہیں پورا کرنے کے لئے وہ کس طرح اپنی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی حکومت بھی عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جب تک اس کے سربراہ ان اصولوں پر خود عمل کر کے دکھائیں جنہیں اس حکومت کی اساس قرار دیا جاتا ہو۔

اسلامی حکومت کا بنیادی اصول

اسلامی حکومت کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ۔ (۱۱/۶) روئے زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ اسلامی حکومت جو خدا کے نام پر لوگوں سے اطاعت لیتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا عہد کرتی ہے۔ اس لئے وہ افرادِ مملکت سے علانیہ کہتی ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ وہ ان میں سے ہر فرد کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۔ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ (۲۰/۱۱۸) ہم ایسا جنتی معاشرہ متشکل کریں گے جس میں تمہیں نہ بھوک کی پریشانی ہوگی نہ لباس کی۔ نہ پیاس کی تکلیف ہوگی نہ سردی گرمی سے بچنے کی۔ اس میں روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ تمام افراد کو میسر ہوگا۔ اس کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی۔

آپ غور کیجئے یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جسے یہ مملکت اپنے سر لیتی ہے۔ اب آپ یہ دیکھئے کہ اس گرانبار ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس مملکت کا سربراہ اپنی زندگی کس قسم کی بسر کرتا ہے۔ اس مملکت کے سب سے پہلے سربراہ خود نبی اکرمؐ تھے۔ آپ کی حیاتِ طیبہ کے دو حصے ہیں، ایک مکی زندگی دوسری مدنی۔

حضورؐ کی مکی زندگی

مکہ کی زندگی میں یہ مملکت قائم نہیں ہوئی تھی لیکن حضورؐ اس جماعت کی تشکیل و تربیت میں مصروف تھے جن کی رفاقت سے یہ مملکت قائم ہوئی تھی۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ آپ کی مکی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی لیکن یہ درست نہیں۔ قرآن کریم حضورؐ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ (۹۳/۸)

ہم نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وہ زندگی ایک غنی کی زندگی تھی ۔۔۔۔ یعنی ایسی زندگی جس میں آپ کو اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا تھا۔ لیکن وہاں جماعت کے افراد کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں اس وقت حضورؐ کا اسلوب کیا تھا اس کا اندازہ صحیحین کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ اشعر قبیلہ والوں کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا ان کے ہاں بال بچوں پر دیسے فاقہ کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حضورؐ اور جماعتِ مومنین کا اندازِ زیست ایسا تھا کہ اپنے اپنے کھانے کی چیزوں کو سب اکٹھا کر لیتے۔ اور پھر اس میں سے حصہ رسدی کھا لیتے۔ چونکہ اس وقت جماعت میں اکثریت محتاجوں اور ناداروں کی تھی۔ اسلئے ظاہر ہے کہ اس مساواتی تقسیم میں ہر ایک کے حصے میں کس قدر آتا ہوگا۔ جو کچھ دوسروں کے حصے میں آتا ہوگا وہی حضورؐ کے حصے میں آتا ہوگا بلکہ اس سے بھی کم۔ اس لئے کہ قرآن نے مومنین کا اندازِ زیست یہ بھی تو بتایا ہے کہ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۹/۵۹) وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ خواہ انہیں خود تنگی میں ہی گذارہ کرنا پڑے۔

مدنی زندگی

حضورؐ کی مدنی زندگی میں ایک مملکت وجود میں آگئی تھی۔ آپؐ قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ تھے۔ مولانا شبلیؒ کے الفاظ میں۔

> یہ وہ زمانہ تھا جب تمام عرب، حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا تھا اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آچکا تھا۔ (سیرۃ النبیؐ۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۴۹-۵۲)

لیکن اس کے باوجود آپ نے جس انداز کی زندگی بسر کی اس کے متعلق کتبِ تاریخ و سیر میں ہے کہ

> حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا۔ دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو اکثر آپؐ اور سارا گھر بھوکا رہتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مدینہ کے قیام سے وفات تک آپ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔ (ایضاً)

اس پر لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس قدر وسیع علاقہ آپؐ کے زیرِ نگین تھا۔ اتنی بڑی سلطنت کے آپؐ

عسرت کی زندگی کیوں؟

سربراہ تھے۔ مدینہ میں زرد سیم کا سیلاب آ چکا تھا تو پھر آپ اس قدر عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے۔ اس کا جواب بالعموم یہ دیا جاتا ہے کہ خدا نے حضورؐ کے سامنے دُنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا تھا۔ آپ نے آخرت کو ترجیح دی اور سب کچھ میسر ہونے کے باوجود آپ نے نہایت تنگدستی اور عسرت کی زندگی بسر فرمائی۔ لیکن یہ توجیہہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ دُنیاوی آسائش و لذائذ کو قابلِ نفرت سمجھ کر ترک کر دینا، رہبانیت ہے جسے قرآن عیسائی راہبوں کا خود ساختہ مسلک قرار دیتا ہے جب کہتا ہے کہ وَرَهْبَانِيَّةً ۟ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ (۵۷/۲۹) اس مسلک رہبانیت کو انہوں نے خود وضع کر لیا تھا اسے ہم نے ان پر واجب نہیں ٹھہرایا تھا۔ اس کے برعکس قرآن دنیاوی آرائش و زیبائش کی چیزوں کو وجہِ جاذبیت قرار دیتا ہے اور پوری تحدی سے کہتا ہے کہ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) ان سے کہو کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیتا ہے؟ اور نبی اکرمؐ سے تو خاص طور پر کہا گیا کہ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ... (۶۶/۱) اے نبی! جس چیز کو خدا نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے، تو اسے کیوں حرام کرتا ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ اس لئے تنگدستی اور عسرت کی زندگی بسر نہیں کرتے تھے کہ آپ نے دنیاوی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو قابلِ نفرت قرار دے کر ترک کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مملکت کے وجود میں آجانے سے حضورؐ کی ذمہ داریوں میں بیحد اضافہ ہو گیا تھا۔ ملک میں خوش حال لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔

اکثریت غریبوں کی تھی

باقی سب مفلوک الحال، ضرورت مند مفلس اور نادار تھے جن کی کفالت مملکت کے ذمے تھی۔ ناداری کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے سواری تک نہیں ہوتی تھی۔ اور مملکت کے ذرائع اس قدر محدود تھے کہ ان کے لئے سواری کا انتظام کرنا، اس کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔ یہی وہ حالت تھی جس کا نقشہ سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنفِقُونَ ——— (۹/۹۲)

نہ ہی ان لوگوں پر جہاد میں عدم شرکت کی وجہ سے کوئی الزام ہے جن کی حالت یہ ہے کہ وہ تیرے پاس درخواست لے کر آئے کہ ان کے پاس سواریاں نہیں۔ تم سواری کا کچھ انتظام کر دو تو تم نے کہا کہ سواری کا تو میرے پاس کوئی انتظام نہیں۔ چنانچہ وہ بصد حسرت و یاس واپس چلے گئے، اس حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور دل اس غم میں ڈوبا جا رہا تھا کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں جس سے

ہم سواری کا انتظام کر لیتے اور جہاد میں شریک ہو سکتے۔

پیچھے افرادِ مملکت کی عام حالت۔ ان حالات میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس مملکت کے سربراہ کو جس کی ذمہ داریوں کا وہ عالم ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے کس قسم کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ دنیا کی عام مملکتوں میں (خواہ) سربراہ مملکت یا دیگر اربابِ حکومت کے اخراجات کے لئے سب سے پہلے روپیہ الگ کر لیا جاتا ہے اور جو باقی بچتا ہے اس میں سے دیگر مدات پر صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت میں صورت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس میں سربراہِ مملکت اپنی ضروریات

سربراہ سب سے پیچھے

کو سب سے مؤخر رکھتا ہے۔ وہ اس وقت کھاتا ہے جب سب کھا چکتے ہیں، وہ اس وقت پہنتا ہے جب سب پہن چکتے ہیں۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات اور احتیاجات سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کیطرف سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابو داؤد۔ کتاب الخراج)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جو امام ضرورتمندوں محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کیلئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ (ترمذی۔ کتاب الاحکام)

اسی تفصیل کو حضورؐ نے چند الفاظ میں سمٹا کر یوں بیان فرمایا کہ

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

کوئی فرد تنہا نہ رہنے پائے

مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی فرد کو محسوس تک نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث ہے۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو، اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔

(ترمذی۔ باب الفرائض)

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں وفات پا جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو، تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہو گی۔ حضورؐ نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ

میں مسلمانوں سے ان کے اپنے افراد کی نسبت زیادہ قریب ہوں۔ سو ان میں سے جو مقروض وفات پا جائے تو اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔

(ابو عبید۔ کتاب الاموال)

مقروض کا قرض بھی مملکت ادا کریگی۔ اور اگر وہ اپنے اہل وعیال کو بے سہارا چھوڑ جائے گا تو ان کی ذمہ داری بھی مملکت کے سر پر ہوگی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص کچھ ترکہ چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لئے ہے۔ لیکن جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری میرے سر ہوگی۔ (ترمذی۔ باب الفرائض)

مملکت کی یہ ذمہ داریاں، صرف انسانوں تک محدود نہیں۔ چونکہ قرآن نے کہا ہے کہ "زمین پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو" اس لئے اسلامی مملکت کے حدود میں رہنے والے ہر متنفس کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے ——— جو اسلامی مملکت کے تیسرے سربراہ اور حضورؐ کے جانشین تھے فرمایا تھا کہ

ہر متنفس کے رزق کی ذمہ داری

اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرجائے تو عمرؓ سے اس کی بھی بازپرس ہوگی۔

(توفیق الرحمان۔ مطبوعہ مصر)۔

اس مملکت کی ذمہ داری کی انتہا وہ تھی جسے حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں بیان کر دیا جن سے زیادہ جامع الفاظ اس باب میں کہیں نہیں مل سکتے۔ آپ نے ایک خطبہ عام میں فرمایا۔

ایک جامع حقیقت

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک دوں۔ (قواعد الاحکام فی مصالح الانام۔ ابو محمد عزالدین)

یہ بات بڑی بلند اور لطیف ہے اس لئے زیادہ وضاحت طلب ہے۔ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ کسی فرد کی کوئی ضرورت رکی نہ رہے تاکہ اسے اپنی ضرورت کے لئے خدا سے دعا کرنی پڑی۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہے گی تو اسے اپنی ضرورت کے لئے خدا کو پکارنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بالفاظ دیگر اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ گویا مملکت کے خلاف شکایت ہوگی کہ وہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے سے قاصر رہی ہے۔ چنانچہ اس کی تفصیل میں طبری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

تمہارے اور اللہ کے درمیان میں ہوں اور میرے اور اللہ کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے میرے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ میں اس کے حضور جانے والی دعاؤں کو روکوں۔ لہٰذا تم لوگ اپنی شکایتیں میرے پاس بھیجو۔ جو خود ایسا نہ کر سکے وہ کسی دوسرے آدمی تک اپنی بات پہنچا دے تاکہ وہ مجھ تک پہنچا سکے۔ اس کی شکایات پہنچنے پر ہم اس کا حق بغیر کسی تامل و تذبذب کے وصول کرا دیں گے۔

(طبری۔ حوادث سنہ ۱۴ھ)۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی مملکت کا رقبہ ساڑھے ۲۲ لاکھ مربع میل پر پھیل چکا تھا اور ایک عراق کی مال گزاری ساڑھے گیارہ کروڑ درہم تھی۔ لیکن اسی نسبت سے افرادِ مملکت کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اور مملکت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ انہی ذمہ داریوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمرؓ سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مملکت کی آمدنی میں سے آپ کے لئے کس قدر

خلیفہ کا حصہ

لینا جائز ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ۔

> کپڑوں کے دو جوڑے۔ ایک جاڑے کا اور دوسرا گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک احرام۔ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے نفس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں جو ان کا حال سو میرا حال۔
>
> (عمر فاروقؓ۔ از محمد حسین ہیکل)

وہ فرمایا کرتے تھے کہ

> اللہ کا مال میرے لئے ایسا ہے جیسے کسی یتیم کا مال۔ ضرورت نہیں ہوتی تو اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور حاجتمند ہوتا ہوں تو بقدرِ احتیاج لے لیتا ہوں۔ (ایضاً)

ترکِ دُنیا نہیں

اس مقام پر میں اس حقیقت کو پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ یہ دو جوڑے کپڑے اور روکھا سوکھا کھانا اس لئے نہیں تھا کہ آپ ایک تارک الدنیا زاہد کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ اس قسم کے زہد و تورع کے متعلق تو ان کا ردِ عمل یہ تھا کہ

> ایک دن انہوں نے کسی زاہد مرتاض کو دیکھا۔ اس کے پاس گئے اور ایک دُرّہ مار کر بولے "خدا تجھے موت دے۔ ہمارے دین کا کیوں گلا گھونٹتا ہے"۔ (ایضاً)

اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنا اصول یہ بنا لیا تھا کہ مملکت کا سربراہ اپنا معیارِ زندگی ایسا رکھے جو امت کے ہر فرد کو میسر آ سکتا ہو۔ جوں جوں امت کے عام معیار کی سطح بلند ہوتی جائے سربراہِ مملکت کا معیار بھی اونچا ہوتا جائے۔ چنانچہ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ ایک دفعہ مصر کا گورنر آیا تو حضرت عمرؓ کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ

جَو کی روٹی کیوں؟

کھانے میں جَو کی روٹی ہے۔ اس نے کہا کہ اب تو مصر سے کافی مقدار میں گیہوں آ رہا ہے۔ آپ گیہوں کی روٹی کیوں نہیں کھاتے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کا مجھے یقین ہے کہ اس وقت مملکت میں ہر فرد کو جَو کی روٹی میسر آ رہی ہے جس دن آپ مجھے اس کا یقین دلا دیں گے کہ ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے اس دن میں بھی گیہوں کی روٹی کھا لوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مملکت میں ایک فرد بھی ایسا ہو جسے گیہوں کی روٹی میسر نہ آتی ہو اور سربراہِ مملکت گیہوں کی روٹی کھائے۔ جب آپ سے کہا گیا کہ آپ اس قدر عسرت کی زندگی بسر کر کے اپنے آپ کو مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں تو آپ نے اس کا جو جواب دیا وہ ایک اسلامی مملکت کے سربراہ کے احساسِ ذمہ داری کا

صحیح آئینہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

میں رعایا کی دیکھ بھال کیسے کر سکتا ہوں جب تک مجھ پر وہی کچھ نہ بیتے جو رعایا پر بیتتی ہے۔ (ہیکل)۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب ملک میں قحط پڑا تو ارد گرد کی تمام آبادی ہجوم کر کے مدینہ میں جمع ہو گئی۔ آپ نے سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ مدینہ میں کسی کے گھر میں الگ الگ کھانا نہیں پکے گا۔ سب کچھ شہر سے باہر ایک جگہ جمع ہو گا اور اسے سب مل کر بانٹ کھائیں گے۔ چنانچہ خود رئیس مملکت حضرت عمرؓ بھی سب کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانے میں شریک ہوتے تھے۔ ایک دن آپ کے سامنے گھی میں چوری ہوئی روٹی آئی۔ ایک بدوی آپ کے ساتھ شریک طعام تھا جس طرف گھی زیادہ تھا وہ بدوی اس طرف سے بڑے بڑے لقمے مارنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے تم نے کبھی گھی نہیں کھایا۔ اس نے کہا کہ ہاں! میں نے فلاں دن سے آج تک گھی یا تیل نہیں چکھا اور ایک میں ہی کیا کسی کو بھی یہ کچھ میسر نہیں آیا۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت قسم کھائی کہ جب تک لوگ قحط میں مبتلا ہیں وہ گوشت اور گھی کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے گوشت اور گھی جو ان کی معمول کی غذا تھی، چھوڑ دیئے۔ اس سے ان کی صحت پر سخت مضر اثر پڑا۔ رنگت سیاہ پڑ گئی۔ پیٹ میں شکایت پیدا ہو گئی۔ لیکن انہوں نے گھی اور گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پاس بیٹھنے والے اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ لوگوں کو خشک روٹی تک میسر نہیں آتی اور تم کہتے ہو کہ عمرؓ گھی اور گوشت کھائے! یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تھی وہ کہتے تھے کہ

اگر اللہ اس قحط کو دور نہ کر دیتا تو ہمیں اندیشہ تھا کہ حضرت عمرؓ لوگوں کے غم میں جان دے دیتے[1]

اسی قحط کا ذکر ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان کا پوتا ٹکڑی یا ثرید کھا رہا ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ یہ کیا ہے کہ لوگوں کے بچوں کو سوکھی روٹی نہیں ملتی اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے۔ یہ اسے کیسے مل گیا۔ بیٹے نے کہا کہ صبح تمام بچوں کو کھجور کے ستو ناشتے میں ملے تھے۔ اس نے اپنے حصے کے ستو ایک بدو کے لڑکے کو دیکر اس کے بدلے میں یہ ٹکڑی لے لی ہے۔ یہ ہے وہ پھل جو عمرؓ کا پوتا کھا رہا ہے۔ اسے دوسرے بچوں کے مقابلے میں کچھ بھی زیادہ نہیں ملتا۔ آپ مطمئن رہیے۔

قحط کے زمانے میں

یہ تو پھر بھی قحط کا زمانہ تھا۔ ان کے لئے نئی نئی فتوحات کی خبریں بھی محض اس لئے مسرت کا باعث ہوتی تھیں کہ اس سے لوگوں کا معیار زندگی اور بلند ہو جائے گا۔ چنانچہ قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سننے کے بعد آپ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں کہا کہ

خلافت کا مفہوم

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کسی کو ضرورت مند دیکھوں اس کی ضرورت پوری کر دوں۔

---

[1] ہیکل۔ عمرؓ فاروق۔

جب تک ایک دوسرے کی (انفرادی طور پر) مدد کرنے سے ایسا ہو سکے، ہمیں ایسا کرنا چاہیئے۔ جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جائے تو ہمیں سب کو مل کر گذر اوقات کرنی چاہیئے یہاں تک کہ سب کا معیارِ زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش! تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کس قدر خیال ہے۔ لیکن یہ چیز میرے زبانی سمجھانے کی نہیں۔ عمل سے کر کے دکھانے کی ہے۔ خدا کی قسم! میں بادشاہ نہیں کہ تم لوگوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا کر رکھوں۔ میں تو خود خدا کا محکوم اور غلام ہوں۔ حکمرانی کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے اب اگر میں اسے اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ تمہاری چیز تمہاری طرف لوٹا دوں اور تمہارے پیچھے تمہاری خدمت کے لئے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو یہ وہ سعادت ہوگی جو تمہارے ذریعہ مجھے میسر آ جائے گی۔ لیکن اگر میں اس امانت کو اپنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر پر آنے کے لئے مجبور کر دوں تو یہ وہ بدبختی ہوگی جو تمہارے ذریعہ میرے سر پر مسلط ہو جائے گی[۱]۔ (خدا مجھے اس سے محفوظ رکھے)۔

"مملکت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ سب کا معیارِ زیست ایک ہو جائے۔" یہ تھا وہ نصب العین جو ان حضرات کے سامنے رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں دیکھتے کہ افراد و ماتحت کے معیار میں فرق آنے لگا ہے اس کا فوراً تدارک کرتے۔

سب کا معیار ایک

اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب عراق کے بعض جاگیرداروں نے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کی تو اس خوشی میں طرح طرح کے لذیذ اور پر تکلف ایرانی کھانے لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمام لشکر کے لئے ایسے ہی کھانوں کا انتظام کیا گیا ہے یا یہ امیرِ لشکر کی خصوصی دعوت ہے؟ جب انہوں نے کہا کہ یہ صرف آپ کے لئے ہیں تو انہوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اور ان سے کہا کہ جب تک سارے لشکر کے لئے اس قسم کے کھانے کا انتظام نہیں ہوگا میں اسے کبھی نہیں کھاؤں گا[۲]۔

اسلامی مملکت کے سربراہ کی ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھیے اور پھر اس حقیقت پر غور کیجئے کہ نبی اکرمؐ اس قدر فاقے اور عسرت کی زندگی کیوں بسر کرتے تھے؟ بات نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ عوام کا معیارِ زیست بہت پست تھا ان کی ضروریات زیادہ اور سامانِ رزق نسبتاً کم۔ جب تک ان کی ضروریات پوری نہ ہو جائیں حضورؐ کس طرح مرفہ الحالی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔

ضرورت سے زائد سب کچھ دیدے

اس وقت تو ضروریات کا تقاضا یہ تھا کہ ہر شخص کم از کم اپنے پاس رکھے اور باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔

---

[۱] ابن کثیر۔ البدایہ والنہایہ۔ نیز تاریخ طبری۔　　[۲] ہیکل۔ (عمر فاروق اعظمؓ)

اور یہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے عین مطابق تھا کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ــ (۲/۲۱۹)
"تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے وہ سب ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ مسلم کی یہ روایت اسی ارشادِ خداوندی کی عملی تفسیر ہے کہ

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری ضرورت سے زائد ہو وہ اس آدمی کو دیدے جسے اس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زادِ راہ زیادہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اسی طرح آپ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمایا حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زائد کوئی چیز رکھنے کا حق نہیں۔

مسلم کی ایک اور روایت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال، میرا مال کہتا رہتا ہے حالانکہ مال میں اس کا حصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے اور (۳) جو کچھ دوسروں کی پرورش کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے جو مال و دولت کے جمع کرنے کو سختی سے روکا ہے تو یہ اصول اسلامی مملکت کے نظام میں کس طرح فٹ بیٹھتا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے۔

مال و دولت جمع نہیں کئے جا سکتے

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ــ (۹/۳۴)

جو لوگ چاندی سونا (مال و دولت) جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں (ضرورت مندوں کی ضروریات رفع کرنے کے لئے) کھلا نہیں رکھتے تو انہیں الم انگیز عذاب سے آگاہ کر دے۔

اسلامی مملکت میں

(۱) تمام افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔

(۲) مملکت کا یہ فریضہ اس طرح پورا ہوتا ہے کہ ہر فرد کا سب (یعنی جو کمانے کے قابل ہو) پوری پوری محنت سے

کمائے۔ اس میں سے اپنی ضروریات کے مطابق رکھ کر باقی مملکت کے لئے کھلا رکھ دے تاکہ وہ اسے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے کام میں لائے۔

(۴) اس اصول پر سب سے پہلے خود رئیس مملکت کا بند ہوتا ہے اور اس کا طرزِ عمل دوسروں کے لئے نمونہ بنتا ہے۔

ان ضروریات کا تعین کس طرح ہوتا ہے اس کا اندازہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک واقعہ سے لگتا ہے۔ ایک دن آپ نے کھانے کے بعد بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز ہو تو دیجئے۔ اس نے کہا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے اس میں میٹھی چیز شامل نہیں ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے کے ساتھ تھوڑا سا حلوہ بھی ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ راشن میں میٹھی چیز نہیں آتی۔ یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ اس نے کہا کہ میں ان دنوں مٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ جب وہ کافی ہو گیا تو اس کے عوض بازار سے کھجور کا شیرہ منگالیا اور حلوہ پکا لیا۔ آپ کھانے سے فارغ ہو کر سیدھے بیت المال میں گئے اور راشن بانٹنے والے سے کہا کہ ہمارے ہاں جس قدر روزانہ آٹا دیا جاتا ہے اس میں ایک مٹھی کی کمی کر دی جائے کیونکہ تجربے نے بتایا ہے کہ آٹے کی موجودہ مقدار ہماری روزانہ ضرورت سے بقدر ایک مٹھی کے زیادہ ہے۔

ہمیں یہ باتیں آج افسانہ سی نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ افسانے نہیں حقیقتیں ہیں۔ جو شخص منابع ملت کو امانت سمجھے اور اپنے آپ کو اس کا امین۔ اور اس کا ایمان ہو کہ اسے اس امانت کے ایک ایک ذرے کا حساب دینا ہو گا۔ وہ اپنی ضروریات کے تعین میں ایسا ہی محتاط ہو گا۔ اسی احتیاط کا نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت بیٹے سے کہا تھا کہ معلوم نہیں کہ میں نے قوم کے مال میں سے جس قدر اپنی ضروریات کے لئے لیا ہے اتنا قوم کا کام کر سکا ہوں یا نہیں؟ بہتر یہی ہے کہ تم حساب کر کے اتنا روپیہ قرض لے کر بیت المال میں داخل کر دو تاکہ میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر خدا کے حضور جاؤں۔ چنانچہ ایسا کر دیا گیا۔

حضورؐ کا ترکہ

اسی سے ایک اور حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب اصول یہ ٹھہرا کہ کوئی شخص اپنی ضروریات سے زائد اپنے پاس رکھ نہیں سکتا تو ایسے معاشرہ میں جائدادیں کھڑی کرنے اور انہیں ترکہ میں چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے حضورؐ نے واضح الفاظ میں فرما دیا تھا کہ۔

> میرے ورثا میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہو گا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کی ضروریات کے بعد جو کچھ بھی بچے، صدقہ ہو گا۔ (بخاری)

اسی سلسلہ کی اگلی کڑی وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> مرض الموت کے ایام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے۔ اور حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو۔ لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔

آپ کو ہوش آیا تو فرمایا، وہ دینار لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر کہا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہوگا جبکہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہوں۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا[1]۔

مسلمؒ کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار۔ نہ بکری نہ اونٹ۔ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اسی طرح بخاریؒ کی ایک روایت میں ہے کہ

رسول اللہؐ نے اپنی وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم۔ نہ غلام نہ لونڈی۔ اور نہ کوئی اور چیز سوائے اپنے ایک خچر کے اور اپنے ہتھیار کے۔ اور اس زمین کے جسے آپ نے صدقہ کر دیا تھا۔

مولانا شبلی نے "سیرۃ النبیؐ میں" "متروکات" کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔

آنحضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات اور جائدادیں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں؟ اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپؐ اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے۔ اگر کچھ تھا بھی تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے کہ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَاہُ صَدَقَۃٌ ہمارا کوئی وارث نہیں، جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔

صدقہ کے معنی

"صدقہ" کا لفظ ہمارے ہاں تو خیرات کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے (جب دین، اجتماعی نظام کے بجائے انفرادی رہ جائے — جسے مذہب کہتے ہیں — تو اس میں خیرات سے بلند کوئی تصور ہو ہی نہیں سکتا) لیکن دین میں اس اصطلاح سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ شے کسی کی ذاتی ملکیت نہ رہے۔ بلکہ ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ ہم نے بخاری کی روایت میں (اوپر) دیکھا ہے کہ حضورؐ کے پاس وفات کے وقت کچھ زمین بھی تھی جس کے متعلق آپؐ نے فرمایا کہ وہ بھی صدقہ ہے۔ قرآنی نظام میں زمین کی یہی پوزیشن ہوتی ہے۔ جن چیزوں پر نوع انسانی کی زندگی کا بنیادی طور پر دارومدار ہے وہ اللہ کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ مفت عطا ہوتی ہیں۔ مثلاً ہوا۔ پانی۔ روشنی وغیرہ۔ ان پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔

زمین کی پوزیشن

یہی پوزیشن زمین کی ہے۔ یہ تمام نوع انسان کی پرورش کا ذریعہ ہے اور خدا کی طرف سے مفت ملی ہے — وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (۵۵/۱۰) اور ہم نے زمین کو تمام مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (۵۶/۷۳) رہنا چاہیئے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے

---

[1] اصح السیر۔ حکیم داناپوری۔

کیساں طور پر کھلی (AVAILABLE)۔ حضورؐ نے دین کا جو نظام قائم کیا تھا اور جس کی عملی تکمیل رفتہ رفتہ حضورؐ کے سچے جانشینوں کے دور میں ہوئی تھی اس میں رزق کے اس اولین سرچشمہ کی یہی پوزیشن تھی۔ "زمینداری" کا رواج دُنیا میں بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے — یعنی زمین کو ذاتی ملکیت سمجھنا اور اسے کاشتکاروں کو کرائے پر دے دینا — عربوں کی بنیادی معیشت زراعت نہیں تھی۔ لیکن جہاں جہاں یہ کیفیت تھی وہاں زمینداری کا بھی رواج تھا۔ حضورؐ نے اس سے منع فرمادیا۔ چنانچہ مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

> حضرت رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کے زمانے میں زراعت کے لئے تہائی۔ چوتھائی یا غلہ کی کوئی خاص مقدار متعین کرکے زمینیں بٹائی پر دیتے تھے۔ ایک روز میرے ایک چچا میرے پاس آئے اور کہا کہ رسول اللہ نے ہمیں ایک ایسے کام سے روکا ہے جو ہمارے لئے نفع بخش تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرماں برداری زیادہ نفع بخش ہے۔ حضورؐ نے ہمیں اس بات سے منع کردیا ہے کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں۔ یعنی تہائی۔ چوتھائی۔ یا مقررہ مقدار کے غلہ کے عوض زمین کو کرایہ پر دے دیں۔ آپ نے حکم دیا ہے کہ مالک زمین خود کاشت کرے یا کسی دوسرے بھائی کو کاشت پر دے دے اور آپ نے زمین کے کرائے کو اور اس کے علاوہ دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔

یہ عملی حکم اس اصول کی تشریح تھا جسے حضورؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

> زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ اس لئے اللہ کی زمین، اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔ (ابوداؤدؒ)

اور جب آپ نے اس قطعۂ زمین کے متعلق، جو آپؐ کے ذاتی اخراجات کے لئے آپ کی تحویل میں تھا فرمایا کہ وہ صدقہ ہے تو وہ بھی اس اصول کی عملی تفسیر تھی۔ اس لئے کہ رسول سب سے پہلے خود احکام خداوندی پر عمل کرتا ہے اور اس طرح اس کا عمل دوسروں کے لئے نمونہ بنتا ہے۔ یہی حیثیت اسلامی مملکت کے سربراہ کی ہوتی ہے۔ وہ خود ان قوانین پر عمل کرکے دوسروں کے لئے مثال بنتا ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی میں چونکہ یہ دونوں حیثیتیں یک جا تھیں اس لئے حضورؐ نے دنیا کو دکھادیا کہ قرآن کا پیش کردہ نظام کس طرح قابلِ عمل ہے اور اسلامی مملکت کے سربراہ کی زندگی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔

زمین مملکت کی تحویل میں

زمین کے متعلق قاعدہ یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں کی زرعی زمینیں مالِ غنیمت کی طرح فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کردی جاتی تھیں۔ شروع شروع میں یہ زمینیں کچھ زیادہ نہ تھیں۔ لیکن جب عراق فتح ہوا تو زرعی زمینوں کا وسیع رقبہ مسلمانوں کے ہاتھ آگیا۔ اس وقت اس سوال نے اہمیت اختیار کرلی کہ ان زمینوں کی تقسیم کس طرح کی جائے۔ پہلے حضرت عمرؓ بعض صحابہؓ کے مشورہ سے

اس پر آمادہ ہو گئے کہ یہ زمینیں حسب معمول فوجیوں میں تقسیم کردی جائیں۔ لیکن جب اس سوال پر مزید غور کیا گیا تو آپ نے یہ رائے بدل دی۔ چنانچہ کتاب الاموال (ابو عبید) میں ہے کہ

> جب حضرت عمرؓ جابیہ آئے تو آپ نے زمین کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے کا ارادہ کیا حضرت معاذؓ نے آپ سے کہا خدا کی قسم اس طرح تو وہی کچھ ہوگا جو آپ کو ناپسند ہے۔ اگر آپ نے زمین کو تقسیم کردیا تو بڑے بڑے علاقے ان (موجودہ) لوگوں کو مل جائیں گے۔ پھر یہ مر جائیں گے تو یہ زمینیں (وراثت کے ذریعے) کسی ایک آدمی یا عورت کے ہاتھ میں آجائیں گی۔ پھر ان کے بعد دوسرے لوگ آئیں گے جو اسلام کا دفاع کریں گے تو ان کو کچھ نہیں مل سکے گا۔ آپ غور و فکر کے بعد کوئی ایسا طریقہ اختیار کیجئے جو آج کے مسلمانوں کے لئے بھی موزوں ہو اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی مفید۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت معاذؓ کی بات سے اتفاق کیا (اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہنے دیں)۔

اس کے بعد یہ اصول وضع فرمادیا کہ لَنَا رِقَابُ الْاَرْض (کتاب الاموال) زمین کے رقبے انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں گے۔ تاکہ یہ تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ بنے رہیں۔

ہم نے شروع میں یہ اصول بیان کیا ہے کہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا، اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ حضورؐ کے یہ تمام ارشادات گرامی اور ان پر (خود حضورؐ کا اور حضورؐ کے بعد جانشینوں کا) عمل اس اہم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے تھا۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے الفاظ میں (خلیفۃ المسلمین) کی تو تعریف ـــ (DEFINITION) ہی یہ ہے کہ

اپنے عیال کی طرح شفقت

> خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل و عیال پر شفقت کرتا ہے۔ (ابو عبید۔ کتاب الاموال)

اس شفقت اور خبر گیری کا یہ عالم تھا کہ قحط کے زمانے میں جب لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا تو اس کی نگرانی حضرت عمرؓ خود کرتے تھے۔ ایک دن اسی نگرانی کے وقت آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا ہے۔ آپ نے اس سے کہا "بندۂ خدا! دائیں ہاتھ سے کھا۔" اس نے کہا کہ بندۂ خدا۔ وہ ہاتھ مشغول ہے"۔ آپ آگے بڑھ گئے۔ دوبارہ ادھر سے گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ پھر بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ آپ نے اسے پھر کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اس نے پھر وہی جواب دیا تو آپ نے پوچھا کہ وہ ہاتھ کس کام میں مشغول ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ہاتھ میدان جہاد میں کام آگیا تھا۔

یہ سنکر حضرت عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے اور رونے لگے اور اس سے پوچھنے لگے کہ تمہیں وضو کون کراتا ہے۔ تمہارا سر کون دھوتا ہے۔ کپڑے کون دھوتا ہے۔ فلاں فلاں کام کون کرتا ہے۔

چنانچہ آپ نے اس کے لئے ایک ملازم کا انتظام کردیا۔ اور اسے سواری بھی دلوائی[1] اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس کی

[1] کتاب الآثار۔ امام شیبانی۔

وجہ سے یہ صدر مملکت دن بھر امور مملکت کی سرانجام دہی میں مصروف رہنے کے بعد، راتوں کو تنہا گشت کرتا تھا اور براہ راست یہ معلومات حاصل کرتا تھا کہ رعایا کس حال میں ہے۔ اور کسی کو کوئی شکایت تو نہیں؟ اور

راتوں کو خبرگیری

ان شکایات کے رفع کرنے کی کیفیت یہ تھی کہ جب آدھی رات کے وقت معلوم ہوا کہ ایک خیمہ میں ایک عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے اور دایہ کا کوئی انتظام نہیں تو گھر سے اپنی بیوی کو لے گئے کہ وہ اپنی تکلیف زدہ بہن کی مدد کرے۔ کیا عجیب تھا یہ منظر کہ خیمہ کے اندر (The First Lady of the Land) ایک دیہاتی عورت کی دایہ گری کی خدمت سرانجام دے رہی ہے اور خیمہ کے باہر صدر مملکت اس عورت کے خاوند سے مصروف گفتگو ہے۔ اور ان دونوں میاں بیوی پر یہ راز کہ یہ لوگ کون ہیں) اس وقت کھلتا ہے جب اندر سے بے ساختہ یہ خوش خبری باہر آتی ہے کہ امیرالمومنین مبارک ہو۔ آپ کے بھائی کو اللہ نے بیٹا عطا فرمایا ہے۔

افراد مملکت کے احوال وکوائف کی خبرگیری کا دائرہ کہاں تک وسیع تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جو حضرت عمرؓ کو اپنے شام کے سفر کے دوران پیش آیا تھا۔ ایک شب کسی میدان میں آپ کا قیام تھا۔ حسب معمول گردش کے لئے نکلے۔ دیکھا کہ ایک خیمہ میں ایک ضعیف بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ مائی! کوئی شکایت تو نہیں۔ اس نے کہا کہ جب خلیفہ کو اس سانیاں نہیں کہ وہ رعایا کی شکایات رفع کرے، تو کسی اور کو شکایات بتانے سے کیا حاصل ہے؟ آپ نے کہا کہ تم نے خلیفہ تک اپنی شکایات پہنچائی ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ معلوم کرے کہ رعایا کو کیا شکایات ہیں یا میرا فرض ہے کہ میں اپنی شکایات اس تک پہنچاؤں؟

حضرت عمرؓ اس واقعہ کو ہمیشہ دہرایا کرتے اور باچشم نم کہا کرتے کہ مجھے اس بڑھیا نے بتایا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اور جو شخص خدا کے نام پر حکومت کرتا ہے اسے کس قدر خدائی صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں۔ اسے ایسا خبیر وعلیم ہونا چاہئیے کہ اسے ہر وقت معلوم ہو کہ افراد مملکت کس حال میں ہیں۔ اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس کی بنا پر آپ نے کہا تھا کہ

> اگر میں زندہ رہا تو ایک سال تک اپنی رعایا کے درمیان دورہ کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عوام کی بعض ضروریات ایسی ہیں جن کی مجھ تک خبر نہیں پہنچ پاتی۔ میں پہلے شام جاؤں گا اور وہاں دو ماہ ٹھہروں گا۔ پھر الجزیرہ جاؤں گا وہاں دو ماہ قیام کروں گا۔ پھر بحرین جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا۔ پھر بصرہ جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ ٹھہروں گا۔ پھر مصر جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ قیام کروں گا۔ پھر کوفہ جاؤں گا اور وہاں بھی دو ماہ ٹھہروں گا۔ خدا کی قسم یہ سال کتنا اچھا ہوگا۔[۱]

---

[۱] تاریخ طبری، مسند امام احمد۔

لیکن آپ کی بے وقت شہادت نے آپ کو اس پروگرام پر عمل کرنے کا موقع نہ دیا۔

حضرت عثمانؓ کے متعلق حضرت موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عثمانؓ کو منبر پر بیٹھ کر جب کہ مؤذن نماز کے لئے اقامت کہہ رہا تھا لوگوں سے ان کے حالات، خبریں اور اشیاء کے نرخ دریافت کرتے سنا۔[۱]

یہ حالات اس لئے دریافت کئے جاتے تھے کہ افرادِ مملکت کی ضروریات کا پورا کرنا اور ان کی شکایات کا رفع کرنا رئیسِ مملکت اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کی ابتدائی شکل تو وہ تھی جس کی طرف نبی اکرمؐ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا تھا کہ میں قبیلۂ اشعری میں سے ہوں جن کا مسلک یہ ہے کہ عسرت کے زمانہ میں تمام افراد اپنا اپنا کھانا ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں اور سب مل کر کھا لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب حالات بہتر ہو گئے تو افرادِ مملکت کے **وظائف** مقرر کئے گئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ہر بچے کا وظیفہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی لگ جایا کرے۔ نبی اکرمؐ اور حضرت ابوبکرؓ صدیق کے زمانے میں یہ وظائف ضروریات کے اعتبار سے یکساں طور پر ملتے رہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں فرقِ مدارج کر دیا۔ یعنی جن حضرات نے اسلام کی خدمت میں سبقت کی تھی، انہیں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ دیا۔ کچھ عرصہ بعد حضرت عمرؓ نے خود ہی محسوس کر لیا کہ اس طرح ان لوگوں کے پاس جنہیں ان کی ضروریات سے زیادہ ملتا ہے۔ فاضلہ دولت جمع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر نظرِ ثانی کا ارادہ کر لیا۔ طبری میں ہے کہ

امیروں سے دولت لے کر

> حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ (وظائف کے سلسلے میں) جو امور پہلے میں طے کر چکا ہوں، اگر مجھے آئندہ ان کے طے کرنے کا موقع ملا تو میں امیروں سے ان کی فاضلہ دولت لے کر مہاجرین کے ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کر دوں گا۔

دوسرے مقام پر ہے کہ آپ نے فرمایا کہ

> اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو (وظائف میں) سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے اوپر کے لوگوں کے ساتھ ملا دوں گا۔ (طبقات ابن سعد)

اور آپ کا یہ فیصلہ قرآن کریم کے اس حکم کے عین مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے کہ

> وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ۗ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (16/71)

جہاں تک روزی کمانے کا تعلق ہے خدا نے مختلف افراد کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ سو جو لوگ زیادہ رزق کما لیتے ہیں وہ فاضلہ رزق کو ان لوگوں کی طرف لوٹا کیوں نہیں دیتے جو ان کے زیردست ہیں۔ تاکہ اس طرح (ضروریات پوری ہونے کی جہت سے) سب مساوی ہو جائیں۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے

۱؎ مسند امام احمد

وہ درحقیقت خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا انکار کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ روایات میں جو یہ آتا ہے کہ حضورؐ کس قدر فقر و فاقہ اور عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے، تو اس کی وجہ کیا تھی؟ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس کی

فقر و فاقہ کی وجہ

وجہ وہ نہیں تھی جو ہماری وعظ کی مجلسوں اور سیرت کے جلسوں میں بالعموم بیان کی جاتی ہے۔ وعظ کی محفل میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ واعظ، حضورؐ کی عسرت اور تنگدستی اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ مصائب و آلام کی داستانیں نہایت سوز و گداز سے بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا اپنے مقرب بندوں کی اس طرح آزمائش کرتا ہے۔ ایسا کہہ کر خود بھی روتا ہے اور سامعین کو بھی رلاتا ہے۔ لیکن حضورؐ کی سیرت طیبہ کی یہ صحیح تصویر نہیں۔ یہ فقر و فاقہ، خدا کی طرف سے ابتلا و آزمائش نہیں تھا۔ نہ ہی یہ (معاذ اللہ) کوئی ایسی مصیبت تھی جس کے ذکر پر ہم خون کے آنسو بہائیں۔

یا (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) یہ کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں پیش کر دی گئی تھیں آپؐ نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی اور اس لئے ساری عمر عسرت اور تنگدستی میں گزار دی۔ حضورؐ کی سیرت اقدس کی یہ تعبیر بھی درست نہیں۔ آپ دنیا کو رہبانیت کی تعلیم دینے کے لئے نہیں آئے تھے۔ آپ اسلام کی تعلیم عام کرنے اور اس پر عمل کر کے دکھانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی نعمتوں اور قوتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کیا جائے اور پھر انہیں احکام خداوندی کے مطابق نوع انسان کی بہبود کے لئے عام کر دیا جائے۔

یا جب یہ روایات بیان کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے اپنے ترکہ میں کوئی مال و دولت نہیں چھوڑا اس کے متعلق فرما دیا کہ ان کا وارث کوئی نہیں یہ تمام مسلمانوں کے مفاد کے لئے عام ہیں تو اس کے متعلق یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ حضورؐ کے لئے خصوصی احکام تھے۔ عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھے۔ حالانکہ یہ بھی غلط ہے۔

حضورؐ کے لئے دوسرے مسلمانوں سے الگ جو خصوصی احکام تھے ان کی صراحت خود قرآن نے کر دی ہے (مثلاً حضورؐ کی ازواج مطہرات کا امہات المومنین ہونا۔) جن احکام کے متعلق قرآن نے ایسی تصریح نہیں کی، وہ سب کے لئے عام تھے۔ اس لئے حضورؐ نے جس نہج کی زندگی گزاری اور ترکہ اور وراثت کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ اسلام کے عام منشاء کے مطابق تھا۔

واضح رہے کہ قرآن کریم میں وراثت وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس زمانے سے متعلق ہیں۔ جب ہنوز اسلام کا مملکتی نظام اپنی مکمل شکل میں متشکل نہ ہوا ہو۔ یا وہ نظام، بعض اشیاء کو افراد کی ملکیت میں رہنے دے۔ اسلامی نظام میں کیفیت وہی ہو گی جس کا نقشہ ہمارے سامنے سیرت محمدیہ میں آتا ہے۔ یعنی ہر لمحہ ضرورت چیز ملت کی تحویل میں چلی جائے گی تاکہ اس سے ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ یہ نہج زندگی رسول اللہ کے لئے خاص نہیں تھا۔ قرآن کی رو سے عام اسلامی نہج زندگی ایسا ہی ہے۔

اور جن لوگوں کو کوئی اور دلیل نہیں ملتی، وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں

وہ تو رسول تھے

کہ بھائی! وہ تو خدا کے رسول تھے۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنا کیا تمہارے بس کی بات ہو سکتی ہے؟ وہ کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے کہ میں حضورؐ جیسی زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ توبہ توبہ! معاذ اللہ! یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔

لیکن یہ کہتے ہوئے وہ اتنا نہیں سوچتے کہ اگر ایسی زندگی صرف ایک رسول ہی بسر کر سکتا تھا اور اس کے علاوہ کسی اور انسان کے لئے ایسی زندگی بسر کرنا ممکن نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی سیرت کو تمام مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ کیوں قرار دیا۔ اسوہ نمونہ تو وہی ہو سکتا ہے جس کے مطابق بن جانا دوسروں کے لئے ممکن ہو۔ اگر ہم زندگی کی گزرگاہوں پر حضورؐ کے نقوشِ قدم پر چل ہی نہیں سکتے۔ اگر اس راستہ پر چلنا نبی کے سوا کسی اور کے لئے ممکن نہیں تو حضورؐ کی سیرت طیبہ

اسوۂ حسنہ

ہمارے لئے نمونہ کس طرح بن سکتی ہے اور اس کے مطالعہ اور تذکرہ سے ہمیں فائدہ کیا پہنچ سکتا ہے۔ بجز اس کے کہ (معاف فرمائیے) اسے وعظ کی محفلوں میں بیان کر کے سامعین سے داد تحسین لی جائے۔ یاد رکھئے۔ حضورؐ کی سیرت طیبہ ہمارے ہی لئے نہیں، ساری دنیا کے انسانوں کے لئے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) ہے، جس پر ہر زمانے میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے وہی خوشگوار نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں جنہیں حضورؐ نے پیدا کر کے دکھایا تھا۔

یہاں یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ حضورؐ کی سیرت طیبہ کے اس اہم گوشے کے متعلق اس قسم کی تاویلات اور توجیہات

یہ تاویلات کیوں؟

کیوں کی جاتی ہیں؟ اس کی وجہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ ہمارے ارباب شریعت ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ۔

(۱) اسلام کی رو سے یہ بالکل جائز ہے کہ انسان جس قدر جی چاہے دولت کے انبار جمع کرتا رہے۔ جتنی جائدادیں جی چاہے کھڑی کرے اور ان سے آمدنی پیدا کرتا جائے۔ جس قدر جی چاہے زمین خریدتا جائے اور اسے پٹہ یا بٹائی پر کاشتکاروں کو دیتا جائے۔ جس کاروبار میں جی چاہے اپنا سرمایہ لگا کر بغیر محنت کئے نفع حاصل کرتا جائے۔ اسلام دولت جمع کرنے اور جائدادیں بنانے پر کسی کی حدبندی عائد نہیں کرتا۔

(۲) رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ وہ جسے چاہے کروڑپتی بنا دے، جسے چاہے غریب و نادار رکھے۔ امیروں کے لئے اتنا ہی ضروری ہے کہ وہ اپنی دولت میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ دیتے جائیں یا غریبوں اور محتاجوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے بطور خیرات ڈال دیا کریں۔ اس سے زیادہ ان پر کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہی اسلام کا صحیح نقشہ ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کی سیرت طیبہ اس نقشے میں فٹ نہیں بیٹھتی تو بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ اسلام کا جو نقشہ وہ پیش کر رہے ہیں کہیں وہ تو غلط نہیں، وہ حضورؐ کی سیرت کی ایسی تاویلات شروع کر دیتے ہیں جس سے یہ بھی اپنے مقام پر صحیح رہے، اور وہ نقشہ بھی عین مطابق اسلام سمجھا جائے جسے وہ پیش کرتے ہیں۔ یہ ہے ان کی تاویلات و توجیہات کی کوششوں کا جذبۂ محرکہ ـــ اگر ہمارے سامنے

اسلام کا وہ نقشہ ہوتا جسے قرآن کریم پیش کرتا ہے تو حضورؐ کی سیرت کے اس گوشے کے متعلق کسی تاویل و توجیہ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ یہ اس نقشے میں بالکل فٹ بیٹھ جاتا، اور دنیا دیکھ لیتی کہ قرآن کریم انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی کا جو تصور پیش کرتا ہے۔ حضورؐ کی سیرت طیبہ کس طرح اس کی عملی تفسیر ہے۔ اس وقت یہ حقیقت بھی دنیا کے سامنے آجاتی کہ حضورؐ کی فقر و فاقہ کی زندگی، ان ذمہ داریوں کا صحیح عکس ہے، جو نوع انسانی کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا بوجھ اٹھانے والے اسلامی مملکت کے سربراہ کے سر پر عائد ہوتی ہیں اور جن کے

کمر توڑ دینے والی ذمہ داریاں

احساس سے وہ نہ دن کو آرام کرتا ہے نہ رات کو چین سے سوتا ہے تا آنکہ اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کا ہر فرد آرام اور چین کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ انہی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لئے ——— جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے حضورؐ کی کمر توڑ دی تھی۔ (وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ ۹۴/۲) وہ اپنا معیار زیست ایسا رکھتا ہے جو اس مملکت کے غریب ترین فرد کا ہو۔ پھر وہ ان غریبوں کے معیار کو بلند کرنا شروع کرتا ہے تاکہ اس سے خود اس کا اپنا معیار زیست بلند ہو جائے۔ اس طرح پوری

سب سے ادنیٰ معیار

ملت کے معیار کی سطح بلند ہوتی چلی جاتی ہے اور اس بلندی کے سامنے کوئی روک نہیں ہوتی جہاں پہنچ کر یہ کہہ دیا جائے کہ اس سے زیادہ بلند معیار کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اسلامی نظام انسانی زندگی کے معیار کو تا بہ کہکشاں پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کہ نوع انسانی کا ایک طبقہ تو ثریا کی بلندیوں تک پہنچ رہا ہو اور دوسرا طبقہ تحت الثریٰ کی پستیوں میں رینگ رہا ہو۔ اس میں پوری کی پوری امت اوپر کو ابھرتی ہے اور ان ابھرنے والوں میں امت کا سربراہ سب سے پیچھے ہوتا ہے کیونکہ وہ پوری امت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوتا ہے۔ اگر وہ پیچھے سے نکل کر اوپر آ جائے تو یہ ساری عمارت خود اپنے بوجھ سے دب کر نیچے آ گرے۔ چنانچہ جن قوموں اور تمدنوں میں ذمہ دار افراد خود اوپر پہنچ جاتے ہیں اور قوم نیچے رہتی ہے وہ قومیں اور تمدن تباہی اور بربادی کے جہنم کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

سیرت محمدیہ

سیرت محمدیہ ساری دنیا کے ارباب فکر و عمل کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اگر تم انسانیت کی سطح کو بلند کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم انسانیت کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور اپنی سیرت و کردار کو بلند کرتے جاؤ۔ اس طرح جس قدر تم خود بلند ہوتے جاؤ گے اسی نسبت سے انسانیت اوپر کو اٹھتی چلی جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ

بوریا ممنون خواب راحتش تختِ کسریٰ زیر پائے امتش

اس شاہنشاہ بوریا نشین کی حیات طیبہ کا یہ ایک درخشندہ نقش جہاں کشورکشائی و فرماں روائی کے اس عظیم راز کی پردہ کشائی کرتا ہے کہ جو صاحب ہمت اس بار امانت کو اٹھائے، وہ خود تخت کے اوپر نہ بیٹھے۔ تخت کے اوپر قوم بٹھا

بٹھائے اور اس کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر اس کی سطح کو بلند کرتا جائے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار پر انسان کا اٹل ایمان ہو۔ اور وہ زندگی کے اس نقشہ کو اپنا نصب العین قرار دے جسے محمد رسول اللہ والذین معہ کے مقدس ہاتھوں نے عملاً مرتب کر کے دکھایا تھا۔ جس دن دنیا نے اس راز کو پا لیا اور اس نقشے کو اپنا مقصود و مطلوب قرار دے لیا، یہ جہنم جس میں اس وقت ساری دنیا مبتلائے عذاب ہے، جنتِ ارضی سے بدل جائے گا۔ اور زمین سر اٹھا کر آسمان سے کہہ سکے گی کہ

دیدۂ آغازم — انجام نگر!

اور عالم ملکوت کی نور پاش فضاؤں سے تبریک و تہنیت کے یہ نغماتِ جاں فزا، ساکنانِ ارض کے لئے قرّۃ العین گوش بنیں گے کہ

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (۳۳/۵۶)

اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی مملکت کی یہ ذمہ داری صرف اپنی مملکت کے افراد تک محدود نہیں، اس کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور تمام عالم انسانیت کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ "اپنی مملکت" تو وہ عمل (لیبارٹری) ہوتی ہے جس میں سب سے پہلے اس نظام کو عمل میں لایا جاتا ہے۔ جوں جوں ان افرادِ مملکت کی ضروریات پوری ہوتی چلی جاتی ہیں عالمگیر ربوبیت کے اس دائرے کی حدیں آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا منتہیٰ پوری کی پوری نوعِ انسانی کی پرورش نشو و نما ہے۔ اس سلسلہ میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ فرق تو دورِ حاضر کی قومیت پرستی — نیشنلزم کی لعنت کا پیدا کردہ ہے جس نے انسانوں کو، خود ساختہ معیاروں کے مطابق مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دنیا کو بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کا الم انگیز جہنم بنا رکھا ہے۔ اسلامی نظام اس تفریق کو مٹانے کے لئے وجود میں آتا ہے جس نظام کے سربراہ کا یہ اعلان ہو کہ "اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کی ذمہ داری عمرؓ کے سر ہوگی۔" کیا اس نظام میں یہ دیکھا جائے گا کہ جو شخص بھوک سے کراہ رہا ہے وہ اپنی مملکت کا باشندہ ہے یا کسی دوسری مملکت کا، وہ اپنی قوم کا فرد ہے یا غیر قوم کا۔ وہ کالا ہے یا گورا۔ وہ عربی ہے یا عجمی۔ وہ مسلمان ہے یا کافر۔ اس نظام میں اس کی قطعاً تمیز نہیں کی جائے گی۔

عالمگیر ربوبیت

اس میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے لانے والے رسول کا خطاب نہ کسی خاص خطۂ زمین کے لوگوں سے تھا، نہ کسی خاص قبیلہ، نسل یا قوم کے افراد سے، اس کا خطاب پوری نوعِ انسانی سے تھا جب اس نے کہا تھا کہ

نوعِ انسان کی طرف رسول

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ـــــ (۷/۱۵۸)

اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف، خدا کا پیغامبر ہوں۔

اور اسی جہت سے اس رسول کو بھیجنے والے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ـــــــــ (۲۱/۱۰۷)

ہم نے تجھے اقوامِ عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رحمت کے معنی ہیں سامانِ نشو ونما جو بلا مزد و معاوضہ دیا جائے ـــ اور "نشو ونما" میں انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی تربیت اور ارتقاء سب آ جاتے ہیں، لہٰذا حضورؐ کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ تھا کہ عالمگیر انسانیت کی اس طرح نشو ونما ہوتی جائے کہ صحنِ چمنِ عالم میں کوئی غنچہ بن کھلے مرجھا نہ جائے۔ اسی رحمۃ اللعالمینی کا تقاضا تھا جس کی وجہ سے آپؐ نے روم کے شاہنشاہ کو لکھا کہ

"اگر تم نے صحیح راستہ اختیار نہ کیا تو تیری مملکت میں مظلوم کاشتکاروں پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں اس کا سارا بار تیری گردن پہ ہوگا۔ اور ہم پہ یہ فرض ہو جائے گا کہ ان مظلوموں کو اس ظلم سے بچائیں"

سیرتِ محمدیہؐ کا ایک ایک گوشہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا میں جہاں بھی ظلم ہو رہا ہو، وہ مظلوم کی فریاد کو سنے اور اس کی مدد کو پہنچے۔

ہزار ہزار سلام و رحمت ہو نوعِ انسان کے اس محسنِ اعظمؐ پر جس نے اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے دنیا کو بتا دیا کہ جو شخص انسانوں کے معاملات سنوارنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اس کی اپنی زندگی کیسی ہونی چاہیئے۔ یہی وہ حیاتِ طیبہ ہے جس کے نقوش زندگی کی شاہراہ پر تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے اور سارے انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود کا سراغ دیتے ہیں۔ زمانے کی ریگِ رواں پر اگر یہ نقوشِ قدم نہ ہوں تو کوئی راہرو اپنی منزل تک نہ پہنچ سکے۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو ۔۔۔ چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو ۔۔۔ بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

بزمِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اگر آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ

(۱) وہ اسلام کیا تھا جسے نبی اکرمؐ نے دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

(۲) وہ اسلام کس طرح علم و عقل کے معیار پر پورا اُترتا' اور ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

(۳) اس اسلام سے کس طرح "مذہب" سے بیزار نوجوان' دین کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

تو تین باتیں کیجئے

ایک ـــــ ہر اتوار کی صبح ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآن ہوتا ہے اس میں شریک ہو جئے۔

دو ـــــ ماہنامہ طلوعِ اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کیجئے۔ یہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ سے شائع ہوتا ہے۔

تین ـــــ پرویز صاحب کی کتابیں پڑھیئے۔ ان کے لئے ـــــ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی

شاہ عالم مارکیٹ سے ایک کارڈ لکھ کر فہرست منگا لیجئے۔

صفحۂ سلیمی۔

شرفِ انسانیت کی صبحِ بہار

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی!
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی!

گردشِ شام وسحر کے درمیان جب ظلمتِ شب کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چاروں طرف پھیلنے لگتے ہیں تو بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے گویا پوری کائنات ان تاریکیوں میں کھو جائے گی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے گا۔ قدم قدم پر ٹھوکروں کا سامنا ہوگا۔ اور کسی منزل کی طرف چند قدم بھی سلامتی سے نہیں اٹھ سکیں گے۔ لیکن چند ہی لمحوں میں گردشِ لیل ونہار کی ایک اور انوکھی سی کروٹ ان اندیشہ ہائے دور ودراز کو ختم کر دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسماں کی نیلگوں لباط پر ستاروں کی دلکشا انجمن آراستہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور ان آسمانی قندیلوں کی چشمکِ ناز سے نہ صرف حسنِ کائنات کو ایک نئی آب وتاب نصیب ہو جاتی ہے بلکہ اندھیری راہوں میں ہلکی ہلکی شبنمی روشنی کا اجالا بھی بکھر جاتا ہے۔ مزید برآں یہ روشنی کتنے ہی قافلوں کے منزلِ مراد تک پہنچنے کے لئے دلیلِ راہ اور نشانِ منزل کا کام بھی دیتی ہے۔

سلسلۂ نور وظلمت

آسمانی قندیلوں کا یہ سلسلۂ رنگ ونور بڑی دھیمی دھیمی رفتار سے اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی پھیلاتا نمودِ سحر کی عالم آرا تابناکیوں کی طرف بڑھے چلا جاتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے یہ قندیلیں بھی جھلملاتی اور ایک ایک کرکے گم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ سپیدۂ سحر کی نمود کے ساتھ تاریکیوں کا نقاب الٹ جاتا ہے۔ اور خورشیدِ جہاں تاب کی درخشندہ کرنوں سے ساری فضا جگمگا اٹھتی ہے۔ چاروں طرف پھیلی ہوئی اس روشنی میں ہر چشمِ بینا وہ سب کچھ بے نقاب دیکھ لیتی ہے جسے ظلمتِ شب نے نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔

کشمکشِ حق وباطل

یہ تو ہیں عالمِ طبیعیات میں گردشِ شام وسحر اور سلسلۂ روز وشب کی روزمرہ کی جانی پہچانی کیفیتیں۔ آگے بڑھئے اور دنیائے انسانیت میں سلسلۂ رشد وہدایت، کشمکشِ حق وباطل اور

آویزشِ نور و ظلمت کی تاریخ کو سامنے لائیے تو یہاں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیتیں کارفرما نظر آئیں گی۔ وحیٔ آسمانی کے نزول کی داستانیں بتا رہی ہیں کہ کفر و باطل کی پے در پے ظلمتوں میں انبیائے کرامؑ بھی افقِ انسانیت پر درخشندہ ستارے بن کر ابھرے اور مختلف قریوں، قبیلوں، قوموں اور امتوں کے سفرِ زندگی میں نہ صرف نشانِ راہ کا کام دے گئے بلکہ انسانی زندگی کو ایک انوکھا حسن و جمال بھی عطا کر گئے۔ اور پھر ان سب کے بعد حضور رسالت مآبؐ کی تشریف آوری ایسی ہی تھی جیسے ستاروں کے بعد آفتاب عالمتاب کا طلوع۔

مستقل اقدارِ حیات کا سرچشمہ

یہ داستانیں اس حقیقتِ عظمیٰ کا اعلان کر رہی ہیں کہ کارگہِ کائنات میں انسانی زندگی کا آغاز اپنی نوعیت کا وہ عظیم و جلیل انقلاب تھا جس کی مثال تخلیقِ کائنات کے سلسلۂ ماقبل میں قطعاً موجود نہیں تھی۔ صورتِ آدم میں ایک ایسی انوکھی مخلوق منصۂ شہود پر آ رہی تھی جو دیگر اشیائے کائنات سے یکسر مختلف، منفرد اور متنوع خصوصیات کی حامل تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے (بخلِ بشریت) اختیار و ارادہ کے وہ جوہرِ خصوصی حاصل تھے جن سے ہر دوسری مخلوق بے نصیب چلی آ رہی تھی۔ جس خالقِ کائنات نے انسان کی طبیعی ضروریات کے پیشِ نظر یہ سلسلۂ روز و شب قائم کیا اور ہر قسم کے دیگر سامان مہیا کئے اس نے انسانی ذات کے نشو و ارتقاء اور اس کے بنیادی تقاضوں کی بجا آوری کا بھی پورا پورا اہتمام کیا۔ انسانی ذات کی یہ امتیازی خصوصیات اپنے نشو و ارتقاء کے لئے ایک ایسے نظامِ معاشرہ کی تشکیل چاہتی تھیں جو مستقل اقدارِ حیات پر مبنی ہو۔ ایسی مستقل اقدار کو وضع کرنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کا سرچشمہ وہی بارگاہِ عظیم قرار پا سکتی تھی جہاں سے انسانی ذات کو اختیار و ارادہ کی عظیم خصوصیات نصیب ہوئیں۔

وحیٔ آسمانی کا سلسلۂ دراز

آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی پوری تاریخ اور اس کا ایک ایک ورق شہادت دے رہا ہے کہ اس معاملہ میں رب العالمین نے اپنی ذمہ داریوں کو ہمیشہ بہ حسن و کمال پورا کیا۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں انبیائے کرامؑ کی بعثت کا سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ کسی ایسی انسانی منزل کی نشان دہی ممکن نہیں جو رشد و ہدایت کی اس آسمانی روشنی سے محروم اور بے نصیب رہی ہو۔ عقل خود بین کی پست بینی، غلط اندیشی اور بے راہ روی نے جب بھی ان اقدارِ حیات کو زیر و زبر کیا۔ ظلم و جہل کے گھٹا ٹوپ سائے جب بھی رشد و ہدایت کی ان قندیلوں کو اپنے لپیٹ میں لینے کے لئے آگے بڑھے۔ ظلمتِ شب کے اندیشہ ہائے دور دراز نے جب بھی کاروانِ حیات کی منزل اس کی نگاہوں سے اوجھل کی۔ افقِ حیات پر نئے ستارے جلوہ بار ہو گئے۔ حق و صداقت کی نئی روشنی جگمگا اٹھی۔ وحی و نبوت کے یہ روشن ستارے انسانی آبادی کے ہر گوشے میں طلوع ہوئے ہر دور میں یہ سلسلۂ نور درخشاں رہا۔ ان کی بدولت ہر قریے، ہر شہر، ہر قبیلے اور ہر قوم کو اپنی منزل کا سراغ ملتا رہا اور زندگی کی گم گشتہ اقدار بار بار ابھر اور نکھر کر نوعِ انسانی کے سامنے آتی رہیں۔

لیکن ان انبیائے کرامؑ کے مبارک ہاتھوں سے جو قندیلیں روشن ہوئیں۔ وہ ان کی رحلت کے بعد آہستہ آہستہ جھلملانی شروع ہوگئیں اور رفتہ رفتہ بادِ مخالف کی تندی نے انہیں گل کر دیا۔

آخری اور مکمل راہ نمائی

یہ سب کچھ خدائے علیم وحکیم کے طے شدہ پروگرام کے عین مطابق سرانجام پا رہا تھا انسانیت اپنی طفولیت کے مراحل طے کرتی تدریجاً اس دور کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جسے اس کے شباب کا حرفِ آغاز بننا تھا۔ یہی وہ مقام تھا جو حضور نبی اکرمؐ کی عالم آرا نبوت اور رسالت سے مشرف ہوا۔ وہ ذاتِ اقدس واعظمؐ تشریف لے آئی۔ جس کے بعد کسی آنے والے کی ضرورت باقی نہ رہی جس کی وساطت سے نوعِ انسانی کو اقدارِ حیات کے مستقل اور ابدی پیمانے عطا کر دیئے گئے۔ یہ آنے والا خدا کی قدرت کاملہ کا شاہکارِ عظیم بن کر آگیا اور دنیا نے قدیم وجدید کے درمیان ایک حدِ فاصل کا ارفع وعالی نشان قرار پا گیا۔

یہ تھا حسنِ آغاز اس حیاتِ طیبہ کا جس کے صدقے میں سلسلۂ نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ تھی وہ ذات رسالتمآبؐ جس کی وساطت سے وحیٔ خداوندی اپنی قطعی، آخری، مکمل اور کلیۃً محفوظ شکل میں قیامت تک کے نوعِ انسانی کے سپرد کر دی گئی۔ اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ یہ تھے وہ عظیم ترین محسنِ انسانیت جو اپنی زندگی بھر کی جان توڑ کد وکاوش اور سعی وعمل سے ایک ایسا عالم آرا معاشرہ متشکل کر گئے جو سرتاپا احترامِ آدمیت کا کفیل اور نشوونمائے شرفِ انسانیت کا ضامن تھا۔

رسالتِ محمدیہؐ کا مقصود ومنتہیٰ

لیکن یہ چند سطور محض اجمال ہیں حضورؐ کی حیاتِ طیبہ اور تذکارِ جلیلہ کے سرمایۂ عظیم کی۔ تفصیل میں جایئے تو کتنے ہی سوال اُبھر اُبھر کر سامنے آجائیں گے۔ رسالتِ محمدیہؐ کا مقصود ومطلوب کیا ہے؟ نوعِ انسانی اس کی بدولت کیا کچھ پانے کے قابل ہوگئی؟ اس کا وہ کونسا منفرد گوشہ ہے جو حضورؐ کو محسنینِ انسانیت کی صف میں ممتاز ترین مقام ومنصب پر لا کھڑا کرتا ہے اور یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ؎

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا!
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی!!

آیئے ان چند سطور میں تاریخ کے ان عظیم سوالات کا جائزہ لیں اور علیٰ وجہ البصیرت یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ حضور رسالتمآبؐ کی سیرۃ مقدسہ نے انسانی قلوب واذہان کو کس حسین انقلاب سے نوازا اور اس سے انسانی تاریخ میں کیسے حیات آفریں اور روح نواز اثرات مرتب ہوئے۔

اس حقیقت کو کماحقہٗ سمجھنے کے لئے تاریخ انسانی کا وہ دور نگاہوں کے سامنے لایئے جب حضورؐ نے آخری نبیؐ کی حیثیت سے نوعِ انسانی کے سامنے اپنی دعوتِ انقلاب کو پیش فرمایا۔ قرآن نے

ظہر الفساد فی البر والبحر

کے مختصر سے الفاظ میں اس دور کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ یعنی "خشکی اور تری پر فساد پھیل چکا تھا"۔ ہر شے اپنے مقام سے ہٹ چکی تھی۔ چاروں طرف "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا اصول کار فرما تھا۔ زندگی اصول اور قوانین سے محروم ہو چکی تھی۔ اقدارِ حیات تہ و بالا ہو چکی تھیں۔ اور انسان حقیقی آزادی سے کلیتہً بے نصیب ہو کر ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری کے کڑے بندھنوں میں جکڑا جا چکا تھا۔ انسانی بے بسی اور بے چارگی کے اس بھیانک ماحول میں جب حضور اکرمؐ اپنی دعوتِ انقلاب کو لے کر میدان میں نکلے تو قرآن نے آپ کے مقصود و منتہیٰ کا اعلان کرتے ہوئے ایک عظیم حقیقت کو چند الفاظ میں سمٹا دیا اور کہا کہ

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ۔ (۷/۱۵۷)

وہ نوعِ انسانی کے سر سے تمام بوجھ اتار کر رکھ دے گا اُن زنجیروں کو توڑ ڈالیگا جن میں وہ جکڑی چلی آ رہی تھی۔

غلامی اور محکومی کی زنجیریں

یہ زنجیریں کیا تھیں جو انسانیت کو جکڑے ہوئے تھیں اور یہ بوجھل سلیں کیا تھیں جن کے نیچے دبی ہوئی نوعِ انسانی مسلسل کراہ رہی تھی۔ اس کی پوری تفصیل داستانِ بنی اسرائیل میں سامنے آتی ہے۔ جہاں فرعون ملوکیت کے استبداد کا مجسمہ، ہامان مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا پیکر اور قارون سرمایہ داری کا عفریت خونخوار بن کر انسانی دل و دماغ پر اس بے طرح مسلط دکھائی دیتے ہیں کہ اس سے نہ تو ذہنوں میں صحیح فکر کے پرورش پانے کا امکان باقی رہتا ہے اور نہ ہی سینوں میں صحتمند اور خوشگوار آرزوؤں کے نشوونما پانے کی کوئی صورت۔ یہی ہر سہ قوتیں ہیں جن کے باہمی گٹھ جوڑ سے ہر نظامِ باطل نوعِ انسانی کو مبتلائے عذاب رکھتا ہے۔ اسی گٹھ جوڑ کی قہرمانیاں ہیں جن کی ہوس کاریوں سے نوعِ انسانی کا خون نچڑتا رہا اس کی ہڈیاں چٹختی رہیں اس کے قلب و دماغ ماؤف ہوتے رہے۔ روحیں سسکتی رہیں اور آنکھوں سے بے بسی اور حرماں نصیبی کے آنسو بہتے رہے۔

حضور رسالتمآبؐ کا عظیم ترین کارنامہ یہی تھا کہ آپؐ نے نوعِ انسانی کو اس بارِ گراں سے نجات دلائی اس کی محکومی اور بے بسی کی زنجیروں کو توڑ ڈالا اور اسے از سرِ نو وہ سرفرازیاں عطا کیں جن سے وہ محروم چلی آ رہی تھیں۔

حقیقی آزادی کا دور

آزادی کا جذبہ ہمیشہ سے انسانی زندگی کی محبوب ترین آرزو چلی آ رہی ہے۔ اسی آرزوئے دلنواز کی خاطر ہر دور میں انسانوں نے بے تحاشہ سر دھڑ کی بازیاں لگائی ہیں۔ اسی کے سرود جانفزا میں قبیلوں کے قبیلے کفن بردوش میدانِ جنگ کی طرف بڑھتے رہے ہیں۔ اسی بلند مقصد کے لئے قوموں نے آگ اور خون کے سمندر پئے ہیں۔ الغرض آزادی کے نام پر آج تک جس قدر خون کے دریا بہائے گئے کسی دوسرے مقصود و

مطلوب کے لئے اس کا عشر عشیر بھی قربان نہیں کرنا پڑا۔ سوچئے کہ پھر آزادی سے بڑھ کر انسان کی بے تابی تمنا کا مرکز و محور اور کیا ہو سکتا ہے اور اگر کوئی پوچھے کہ حضور نبی اکرمؐ نے نوعِ انسانی کو سب سے بڑھ کر کون سی نعمت عظمیٰ عطا کی تو ہم بے دریغ کہیں گے کہ حضورؐ نے اُسے حقیقی آزادی کی نعمتوں سے مالا مال کیا۔

ایک رسول کا مقام یہ ہے کہ وہ ایمانیات کو احوال و ظروف کے مطابق ایک محسوس و مشہود نظام میں متشکل کرتا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے آزادی کے اس منشور کو دیکھئے جسے ایک رسول کی حیثیت سے حضورؐ نے قرآن کی زبان میں انسانوں کے سامنے پیش فرمایا۔ وہ منشور یہ تھا (اور ہے) کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹)

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اُسے کتاب، حکومت اور نبوت عطا کرے اور پھر وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے غلام بن جاؤ۔ اسے صرف یہ کہنا چاہیئے کہ تم سب اللہ کے اس ضابطہ قانون کی رو سے ربانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو۔ اور اس کی تعلیم اپنے دلوں پر نقش کرتے رہو۔

انسانی آزادی کا یہ منشور بہ بانگ دہل بتا رہا ہے کہ اطاعت کا مرکز و محور صرف خدا کے عطا فرمودہ قوانین بن سکتے ہیں۔ ان قوانین کے علاوہ انسان کسی دوسرے انسان کی اطاعت پر مجبور نہیں کئے جا سکتے۔ اور تو اور وہ برگزیدہ اور مقدس ترین ہستیاں بھی جنہیں خدا کی طرف سے کتاب، حکومت اور نبوت تک کے عظیم المقدر امتیازات سے نوازا جائے یہ حق نہیں رکھتیں کہ انسانوں سے اپنی ذاتی اطاعت کرانے کا دعویٰ کریں۔

انسانی زندگی کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ صرف دوسرے انسانوں پر حکومت قائم کرنے کا جذبہ تھا۔ جس نے قدم قدم پر ملوکیت۔ پیشوائیت اور سرمایہ داری کے عفریت خونخوار کو آگے بڑھایا جس نے انسانی نشو و ارتقا کے امکانات کو ہر دور میں پامال کئے رکھا۔ انسانیت ان بھاری سلوں کے نیچے سسکیاں لیتی اور ان طوق و سلاسل کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی تڑپتی پھڑکتی رہی۔ یہی دوسروں کو غلام بنائے رکھنے کی ہوسناکیاں تھیں جن کی دستبرد میں محکوم اور مظلوم انسانیت نہ تو آزادی کی فضا میں سانس لینے کے قابل ہو سکی۔ اور نہ انسان کی گوناگوں مضمر صلاحیتوں کو ابھرنا اور پھولنا پھلنا نصیب ہوا۔

تاریخ کی ان تلخ داستانوں کی روشنی میں دیکھئے تو صاف نظر آئے گا کہ رسالت محمدیہ کے صدقے میں نوعِ انسانی کو وہ نعمتِ عظمیٰ نصیب ہوئی جس کے لئے وہ صدیوں سے ترس رہی تھی۔ یہ درست ہے کہ آج دنیا میں جمہوریت

کا دور دورہ ہے۔ اور قدم قدم پر یہ نعرہ سنائی دے رہا ہے کہ اطاعت قانون اور صرف قانون کی ہونی چاہیئے۔ یہ نعرہ بڑا دلفریب ہے لیکن سوچئے کہ اس کی عملی تفسیر کہاں نظر آرہی ہے؟ محض یہی نہیں کہ قانون کے پردے میں خود انسانوں کی اطاعت کا سلسلہ جاری ہے بلکہ قانون سازی کے دوران میں ذاتی مفادات اور میلانات کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح قانون کے نام پر حکومت درحقیقت ان انسانوں کی ہوتی ہے جو قانون کو نافذ کرتے ہیں۔

قانون اور صرف قانون کی حکومت

نوعِ انسانی کی حقیقی آزادی کا راز اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ قانون کا نافذ کرنے والا اپنی ذاتی حیثیت کو قانون سے کلیتہً الگ تھلگ رکھے۔ قانون کے نفاذ میں اس کے ذاتی میلانات اور انفرادی خواہشات کو قطعاً کوئی دخل حاصل نہ ہو۔ دوسروں کے دلوں میں یہ احساس تک نہ ابھرنے پائے کہ قانون کو نافذ کرنے والا ہم سے ذرا بھی بالا دست ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ رحمتہ للعالمین نے عالم انسانیت کو حقیقی آزادی کی وہ نعمتِ عظمیٰ عطا کی جو اسے کسی دوسری بارگاہ سے نہ مل سکی تو یہ دعویٰ محض رسمی عقیدت پر مبنی نہیں بلکہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے نقوشِ تابندہ اس دعوے کی صداقت کے ناقابلِ انکار شواہد مہیا کر رہے ہیں۔ حضورؐ خدا کے ایک عظیم نبی اور رسول تھے اور اس حیثیت پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص سچا مسلمان نہیں قرار پا سکتا۔ دوسری طرف حضورؐ کی حیثیت ایک صدر مملکت کی بھی تھی۔ اس صورت میں آپ کے احکام اور فیصلوں کی خلاف ورزی ایک سنگین جرم بلکہ بغاوت سے کم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ایک تیسری حیثیت بشریت کی بھی تھی۔ یہ سرگونہ حیثیتیں اس ایک ذاتِ گرامی میں مرکوز تھیں۔ جس نے دنیا کو آزادی کے ارفع و اعلیٰ مفہوم سے عملاً آشنا کرنا تھا۔ جس نے نوعِ انسانی کو سکھانا تھا کہ اطاعت صرف قانون کی ہو سکتی ہے۔ قانون کو نافذ کرنے والا اپنی ذات کی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔ سوچئے کہ یہ کس قدر نازک مقام تھا اس ذاتِ اقدس و اعظم کی ذمہ داریوں میں؟ خدا کا ممتاز ترین نبی اور رسول (جس کے ساتھ سلسلۂ نبوت اتمام کو پہنچ گیا) ایک عظیم سلطنت کا صدر اعظم (جس کے فیصلوں کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی) اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بشر بھی (جسے بشر" مثلکم کہہ دیا گیا) اور اس عظیم و جلیل اور مقدس ترین انسان (علیہ التحیۃ والسلام) نے آزادی کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے، ہر شعبۂ مملکت پر یہ ثابت کرنا تھا کہ اپنے بے مثال

امتیازات اور عظمتوں کے باوجود قانون کے دائرۂ نفاذ میں وہ انہی جیسا ایک انسان ہے اور اس معاملہ میں اسے دوسروں پر کوئی فوقیت اور برتری حاصل نہیں۔ یہ تھا ذمہ داریوں کا وہ نازک مقام جہاں حضورؐ کھڑے تھے۔

اسے پیشِ نظر رکھئے اور پھر تاریخ کی بارگاہوں سے پوچھئے کہ فخرِ انسانیتؐ نے ان نازک ذمہ داریوں کو کس حسنِ انداز سے نبھایا کیا؟ اس کڑی آزمائش سے کیونکر عہدہ برآ ہوئے اور اس مشکل ترین منصب کو کس اندازِ یکتائی کے ساتھ نبھایا؟

چچا کی محبت اور قانون

آیئے تاریخ کے اوراق الٹیں اور ان نقوش تابندہ کی ایک حقیقت آفریں جھلک نگاہوں کے سامنے لائیں جو ہر دور کے لئے بیش بہا نظائر کی حیثیت رکھتے ہیں اور شاہراہ حیات پر نشانِ منزل بن کر صدیوں سے برابر جگمگا رہے ہیں۔

وہ دیکھئے! عرب و عجم کا تاجدار ؐ جنگ بدر کی فتح کے بعد ایک بوسیدہ سے خیمے میں آرام فرما ہے —— لیکن آرام کہاں؟ —— ساتھ کے خیمے میں جنگی قیدی رسیوں میں بندھے پڑے ہیں۔ ان قیدیوں میں اس شہنشاہ کونینؐ کے سگے چچا عباس بھی ایک قیدی کی حیثیت سے جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ وہی چچا ہیں جنہیں حضورؐ سے بڑی محبت تھی۔ لیکن قبائلی عصبیت کی مجبوریاں انہیں حضورؐ کے خلاف میدانِ جنگ میں کھینچ لائیں اور قریش مکہ کی شکست فاش انہیں قیدی بنا کے آئی۔ بڑھاپا اور قید اور پھر کسی ہوئی رسیاں۔ اس ابتلاء میں ان کے کراہنے کی آواز بیاہ رحمتہ للعالمینؐ کے کانوں تک پہنچ رہی ہے۔ میدانِ بدر کا مقدس فاتحؐ یہ سن رہا ہے اور کسی پہلو چین نہیں۔ صحابہ کبارؓ یہ کیفیت دیکھتے ہیں اور چپکے سے عباس کی رسیاں ڈھیلی کر دیتے ہیں اب کراہوں کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ اس سے حضورؐ کے دل میں کچھ خدشات ابھرتے ہیں اور صحابہؓ سے عباس کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔ صحیح حالات کی اطلاع ملتی ہے تو غیظ و غضب سے چہرہ تمتما اٹھتا ہے اور بڑے غصے سے فرماتے ہیں کہ تم نے عباس کی رسیاں اس لئے ڈھیلی کر دیں کہ وہ میرے چچا ہیں۔ تم نے قانون کے مقابلہ میں رشتہ داری کا پاس کیا؟ بہت برا کیا تم نے۔ اب یا تو باقی قیدیوں کی رسیاں بھی اسی طرح ڈھیلی کر دو ورنہ عباس کی رسیاں بھی کس دو۔

ایک طرف صدر مملکت اور خاتم النبیینؐ کے چچا ہیں اور دوسری طرف قانون کی عظمت۔ صدرِ مملکت نے قانون کے تقاضوں کو پیش نظر رکھا۔ اور اس کے مقابلے میں رشتہ داری اور اقربا نوازی کی اہمیت پائے استحقار سے ٹھکرا دی۔

نازک جذبات اور قانون

جنگ بدر کے ان قیدیوں میں حضورؐ کے داماد ابو العاص بھی شامل ہیں جو ابھی تک حالتِ کفر میں ہیں اور قریشِ مکہ کی حمیت میں شریک جنگ ہوئے تھے۔ قیدیوں کے متعلق فیصلے کے لئے مجلس مشاورت منعقد ہوتی ہے اور فیصلہ کرتی ہے کہ تمام قیدیوں کو قتل کر دیا جائے اور ہر قیدی کا رشتہ دار اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرے۔ اس فیصلے کے مطابق ابو العاص کو خود حضورؐ کے ہاتھوں تہ تیغ ہونا ہے۔ سوچئے کہ تاریخ کا یہ کس قدر نازک مرحلہ ہے! اسلامی مملکت کا صدرِ اعظمؐ جس کے ادنیٰ اشارے پر سر دھڑ کی بازی لگا دینا اہل ایمان کے نزدیک سعادتِ دارین سے کم نہیں وہ اپنے عوامؓ کے اس فیصلے کو خاموشی سے سنتا ہے۔ جانتا ہے کہ اس فیصلے کی بنا پر اپنی بیٹی کا سہاگ خود اپنے ہاتھوں لٹانا ہو گا لیکن اس کے خلاف ادنیٰ کشمکش اس کے سینے میں برپا نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں مجلس مشاورت اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرتی ہے

اور قتل کرنے کے بجائے ان قیدیوں کو زرِ فدیہ کے بدلے میں رہا کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے، لیکن صدرِ مملکت مجلسِ مشاورت کے فیصلوں میں دخل انداز ہونے سے قطعاً اجتناب فرماتے ہیں اور کسی قسم کے "اختیاراتِ خصوصی" تک کو حرکت میں لانے کے روادار نہیں۔

معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ آگے بڑھتا ہے۔ جب زرِ فدیہ کے بدلے قیدیوں کی رہائی کا اعلان ہوتا ہے تو قیدیوں کے ورثا فدیہ کی رقوم لے کر پہنچ جاتے ہیں اور حضورؐ کی بیٹی زینبؓ کی طرف سے بھی اپنے شوہر کی رہائی کے سلسلہ زرِ فدیہ کے طور پر ایک ہار پہنچ جاتا ہے۔ دیکھنے کو کانچ کا ایک معمولی سا ہار۔ لیکن یہ کانچ کا ایک ایک ٹکڑا اپنے اندر مہر و وفا کی کتنی بیش بہا یادیں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ وہی ہار تھا جسے خدیجۃ الکبریٰؓ سے نکاح کی تقریب پر حضورؐ نے انہیں بطور تحفہ پیش کیا تھا اور زینبؓ کی شادی پر خدیجۃ الکبریٰؓ نے تبرک کے طور پر وہی ہار اپنی پیاری بیٹی کو پہنا دیا۔ وہی ہار اب فدیہ کے مال میں پڑا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ اس ہار کو دیکھنے لگتے ہیں اور نگاہیں وہیں جم کر رہ جاتی ہیں۔ حضرت خدیجہؓ جیسی پیکرِ خلوص رفیقہ کے خلوص و ایثار اور وفا و محبت کی سہانی داستانیں ایک ایک کر کے چشمِ تصور کے سامنے جگمگا اٹھتی ہیں اور اس سے جذبات و احساسات پر جو کچھ گزرتی ہے وہ پلکوں پر گوہرِ اشک بن کر نمودار ہوتی ہے۔ ہار سے قلب و نگاہ اور جذبات و احساسات کی اس گہری وابستگی کا اندازہ لگایئے اور دوسری طرف ذمہ داریوں کی نزاکت کا۔ خود صحابہ کبارؓ کی آرزو یہی ہے کہ حضورؐ یہ ہار رکھ لیں۔ بحیثیت امیر المومنین بھی حضورؐ جس طرح چاہیں زرِ فدیہ کی تقسیم کر سکتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اس ہار سے چونکہ ذاتی جذبات کا تعلق ہے اس لئے نہ تو اسے مرضی سے خود رکھتے ہیں اور نہ بیٹی کو واپس بھیجتے ہیں۔ یہ ہار قومی بیت المال کے سپرد کیا جاتا ہے اور پوری مملکت کی متاع قرار پاتا ہے۔ حضورؐ کی حیثیت اب اس کے امین کی سی ہے اور بس۔

ایک امیر المومنین، ایک شہنشاہِ ملت، ایک صدرِ مملکت کے لئے یہ کس قدر نازک مقامات ہیں۔ ایک طرف ذاتی جذبات و میلانات اور معاملات کی دلکشی ہے اور دوسری طرف آزادی کا عظیم اور انقلاب آفریں مفہوم کہ تمام اختیارات کے باوجود قانون کی نگاہوں میں مساویانہ حیثیت کو بہرحال قائم رکھا جائے۔ تاریخِ انسانی میں ایک ہی انسان نظر آئے گا جس نے ان نازک مقامات کی بہ تمام و کمال لاج رکھی اور ایک ایک قدم پر یہ ثابت کر دیا کہ قانون کی بالادستی ہر شے سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اور یہ عظیم و جلیل انسان وہی ذاتِ اقدس و اعظمؐ تھی جس پر سلسلۂ نبوت کی تکمیل ہوئی۔

لاتثریب

چند قدم اور آگے بڑھیئے! فتح مکہ کی تاریخی داستان وجہ شادابیٔ قلب و نگاہ بنتی نظر آئے گی۔ عرب و عجم کا تاجدار اعظمؐ فاتحانہ جاہ و جلال سے حریمِ کعبہ میں رونق افروز ہے۔ اور سرزمین مکہ کے تمام اصاغر و اکابر اس کے حضور میں مجرموں کی حیثیت سے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے سالوں تک اس فخرِ انسانیتؐ اور اس کے جاں نثاروں پر عرصۂ حیات تنگ کئے رکھا۔ انہیں وہ دکھ پہنچائے کہ زمین کانپ

اٹھی۔ آسمان تھرتھرا گیا۔ یہ وہی باطل کے پرستار ہیں۔ جنہوں نے تاریخ کے عظیم ترین محسن انسانیت کو اپنے رفقاء سمیت مکہ سے نکالا۔ ان کی قتل کے منصوبے تیار کئے۔ ان کی گرفتاری کے لئے انعام مقرر کئے اور جب یہ مصائب و مظالم کے ہجوم میں سرزمین مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ اور پے در پے وہاں چڑھائی کرتے رہے۔

لیکن آج یہ ظالم اور جابر اسی رحمۃ للعالمین کے حضور میں شکست خوردہ کھڑے ہیں۔ آج کے مہذب دور کا کوئی فاتح بھی ہوتا تو اپنے غم و غصہ اور شدت انتقام پر قابو نہ رکھ سکتا۔ سارے بین الاقوامی ضابطے دھرے کے دھرے رہ جاتے مکے کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ چوراہے میں پھانسیاں نصب ہوتیں۔ بڑے بڑے سرداروں کی گردنیں آڑتی نظر آتیں۔ کتنی ہی لاشیں پھانسیوں پر لٹکتی دکھائی دیتیں۔ اور ان سنگدلوں اور انسانیت کے دشمنوں کو وہ سبق سکھایا جاتا کہ عرب کی تاریخ اسے فراموش نہ کر سکتی۔

لیکن یہاں فاتح جولیس سیزر یا سکندر اعظم نہیں بلکہ رحمۃ للعالمین ہے۔ وہ رحمۃ للعالمین جس نے خواب آزادی کی حسین ترین تعبیر سے نوع انسانی کو روشناس کرانا تھا۔ وہ ان مجرموں سے بھرے دربار میں یہ سوال کرتا ہے کہ "تم مجھ سے آج کس قسم کے سلوک کے امیدوار ہو؟" مجرموں کی فرط ندامت سے جھکی ہوئی نگاہیں قدرے اوپر اٹھتی ہیں اور رحمۃ للعالمین کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا جائزہ لینا چاہتی ہیں۔ لیکن روئے مبارک پر ایک رحمت بھرا سکون مسکرا رہا ہے۔ اسے دیکھتی ہیں اور ایک ہی جواب لبوں پر ابھرتا ہے کہ "ہم مجرم ہیں۔ لیکن حضور سے وہی امید کر سکتے ہیں جو ایک کریم بھائی سے ممکن ہے" ان مجرموں کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب یہ اسلام کی بارگاہ رحمت میں جھک گئے تو ذاتی جذبات و میلانات کو الگ کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا کہ "میں آج وہی کچھ کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ لاتثریب علیکم الیوم۔ یعنی آج کے دن تم پر ملامت نہیں۔ جاؤ میں نے تمہیں معاف کیا"

اس فیصلے اور اس کے الفاظ پر غور کیجئے۔ کیا نوع انسانی کی پوری تاریخ میں حسن سلوک کی ایسی کوئی دوسری مثال بھی موجود ہے؟ بدترین دشمنوں کی بدترین اذیتوں کو یوں فراموش کر دینا اور ذاتی جذبۂ انتقام سے یوں بالاتر ہو جانا۔ یہ تھا وہ عظیم کردار اور سیرت طیبہ کا بے مثال گوشہ۔ جس کے دامن رحمت میں آزادی کی نعمت عظمیٰ نے نشو و نما پائی اور دنیا کو جیتے جاگتے حقائق کی روشنی میں بتایا کہ آزادی کے دعوے بڑے آسان ہیں لیکن ان کی عملی تعبیر کے لئے کس قدر نازک اور کٹھن مراحل سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔

لونڈی کا جواب

یہ تو تاریخ کے بڑے اہم واقعات ہیں ان سے ہٹ کر اس ذات اقدس کی حیات مقدسہ کے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھئے وہاں بھی قدم قدم پر آزادی کی یہی حسین تعبیریں دلوں کو براتی نظر آئیں گی۔ بریرہؓ ایک لونڈی کی داستان کسے یاد نہیں۔ دنیا کے نزدیک ایک لونڈی کی حیثیت کیا ہوتی ہے لیکن یہی لونڈی جب اپنے مالک (مغیثؓ) سے بگڑ جاتی ہے اور ان کا رشتہ باہمی رنجشوں اور

مجنوں کی زد میں آکر لوٹنا چاہتا ہے تو حضورؐ کو خبر ملتی ہے اور اسلامی مملکت کا یہ صدرِ اعظمؐ بریرہ کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنے مالک سے نباہ کی کوشش کرے۔ لیکن یہ لونڈی وہ تھی جسے اسلام نے اس کے مقام سے آگاہ کر دیا تھا۔ سوچئے کہ اس زرخرید لونڈی نے کیا جواب دیا ہوگا؟ آپ کا خیال ہوگا کہ جواب کیا۔ لونڈی نے خود اسر جھکا دیا ہوگا۔ لیکن نہیں! ایسا نہیں ہوتا۔ حضورؐ کی نبوت کے صدقے میں اس لونڈی نے اپنا مقامِ انسانیت اور آزادی کا مفہوم بخوبی سمجھ لیا تھا۔ جواباً وہ حضورؐ سے پوچھتی ہے کہ "یہ حضورؐ کا ذاتی مشورہ ہے یا خدا کا کوئی حکم ہے؟" اور جب حضورؐ فرماتے ہیں کہ "نہیں بریرہ! یہ میرا ذاتی مشورہ ہے خدا کا حکم نہیں"، تو بریرہ کا جواب یہ ہوتا ہے کہ "پھر حضورؐ معاف فرمائیے میں مغیث کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی"۔ یہ جواب مملکت کے صدرِ اعظمؐ کو دیا جا رہا ہے اور اس ذاتِ اقدسؐ کو جس کی نبوت و رسالت پر ایمان لانے سے بریرہ کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی اور یہ صدرِ اعظمؐ یہ جواب سنتا ہے اور پیشانی پر ادنیٰ شکن لائے بغیر مسکراتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ حسین مسکراہٹ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ مسلمان لونڈیاں تک حقیقی آزادی کے شعور سے بہرہ ور ہوتی جا رہی ہیں۔ بریرہؓ کا یہ جواب شانِ رسالتمآبؐ میں (معاذ اللہ) کسی گستاخی کا ترجمان قرار نہیں پاتا بلکہ آزادی کے اس ابھرتے ہوئے تصور کا آئینہ دار سمجھا جاتا ہے۔ یہی مقصودِ دین ہے اور یہی رسالتِ محمدیہ کی غایت۔

ایک غلام کا مقام

اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ سامنے لایئے وہ تاریخی واقعہ جسے خود قرآن نے اپنی دفتین میں قیامت تک کے لئے محفوظ کر لیا۔ حضرت زیدؓ کا واقعہ۔ وہ زیدؓ جو کبھی حضرت خدیجہؓ کا زرخرید غلام تھا اور انہوں نے اسے حضورؐ کی خدمت کے لئے پیش کر دیا۔ لیکن سعد بختی ملاحظہ ہو کہ یہ غلام جلد ہی حضورؐ کا منہ بولا بیٹا بن گیا اور پھر حضورؐ کی نظرِ رحمت نے اسے فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا اور اس کی شادی قریش کی ایک معزز خاتون اور اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ سے کر دی۔ سوچئے کہ قریش کی قبائلی عصبیت کی موجودگی میں خود اس فیصلے کے لئے کس دل گردے کی ضرورت تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ یہ رشتہ پروان نہ چڑھ سکا۔ اور شوہر و بیوی کے تعلقات کشیدگی اختیار کر گئے۔ حضورؐ کے دل پر اس سے کیا گزری اس کا اندازہ آسان نہیں۔ آپ نے یہ سب کچھ سنا اور ایک دن زیدؓ کو بلا کر (قرآن کے الفاظ میں) فرما دیا — اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ (۳۳/۳۷)۔ بالفاظِ دگر یہ کہا کہ زیدؓ! میری بہن کو طلاق نہ دو۔

تاریخ کا یہ کس قدر نازک مقام ہے! اسلامی سلطنت کا صدرِ اعظمؐ اور امیر المومنینؐ ایک غلام سے کہہ رہا ہے کہ میری بہن کو طلاق نہ دو۔ — وہ غلام جسے اس صدرِ مملکت نے تربیت دی۔ غلام سے منہ بولا بیٹا بنایا اور پھر خاندان، نسل، رنگ اور قبیلہ کے سارے بت توڑ کر اس سے اپنی بہن کا رشتہ کر دیا۔ اور اب کہہ رہا ہے کہ اس رشتے کی لاج رکھو۔ اس کے بعد ہوا کیا؟ آج شاید اس کا تصور بھی ممکن نہیں جو زیدؓ نے اس کے جواب میں کہا۔ یعنی یہی کہ سب سے پہلے یہ پوچھا کہ آیا یہ وحی کا حکم ہے یا حضورؐ کی ذاتی سفارش۔ اور جب حضورؐ فرماتے ہیں کہ یہ آپ کی ذاتی آرزو ہے۔ وحی کا حکم

نہیں تو (بریرہ لونڈی کی طرح) زینبؓ کا جواب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کا زینبؓ سے مزید نباہ ممکن نہیں۔

یہاں ایک لمحہ تک کر سوچئے کہ اگر یہی معاملہ حضورؐ کے بجائے کسی دوسرے حاکم وقت سے ہوتا تو زیدؓ سے کیا سلوک روا رکھا جاتا۔ یہ جواب کس قدر حکم عدولی پر مبنی قرار پاتا۔ اور اس کے لئے کس قدر ہولناک سزا تجویز ہوتی۔ حکمران کو چھوڑیئے یہ صورت اگر ہمارے ہاں کے کسی عالم دین، مفتئ شرع متین یا پیشوائے طریقت سے درپیش ہوتی تو زیدؓ کے جواب کو کیسی ناقابل برداشت گستاخی پر محمول کیا جاتا۔ کس طرح رگیں پھلا پھلا کر مغلظات سنائی جاتیں اور کس طرح "بے ایمان اور مردود" قرار دے کر اسے "سیدھا جہنم رسید" کر دیا جاتا۔

لیکن یہاں معاملہ کسی "مستبد یا جمہوریت پسند" حکمران کا ہے نہ شریعت و طریقت کے مقدس پیشواؤں کا۔ بلکہ نوع انسان کے اس محسن اعظمؐ کا ہے جو انسان کی محکومی و غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور انہیں ہر نوع کے استبداد کی بھاری اور بوجھل سلوں کے بارگراں سے نجات دلانے آیا تھا۔ وہ زیدؓ کا جواب سنتا ہے اور زیدؓ سے اس کی محبت و شفقت برابر قائم رہتی ہے۔ زیدؓ زینبؓ کو طلاق دے دیتا ہے اور اس کے بعد بھی رحمتہ للعالمین کے حسن کرم کی بارشیں اسے پہلے کی طرح سیراب کئے رکھتی ہیں۔ چنانچہ قیصر روم کے خلاف جو لشکر مرتب ہوتا ہے، امرائے قریش کی مخالفت کے باوجود اس کی سپہ سالاری کا اعزاز انہی حضرت زیدؓ کے بیٹے (غلام ابن غلام) حضرت اسامہؓ کے حصہ میں آتا ہے۔

تاریخ کے صفحات اس قسم کی حیات افروز اور زندگی بخش داستانوں کی نظیر پیش کرنے سے یکسر عاجز دکھائی دیتے ہیں۔ معاملہ ان دو چار مثالوں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ داستانیں حضورؐ کی حیات مقدسہ کے سینکڑوں صفحات پر پھیلتی چلی گئی ہیں۔ حضورؐ کے عہد ہمایوں کے یہی وہ بیش بہا نظائر ہیں جن کے نقوش تابندہ سے انسانیت اپنے حاصل معراج کو پہنچی اور تاریخ انسانی کا وہ حسین ترین باب ترتیب پایا جس کی ایک جھلک دوبارہ دیکھنے کو آسمان کی نگاہیں ترس گئیں۔ یہی زریں باب تاریخ انسانی کا وہ بے مثال شاہکار ہے جس سے مقام انسانیت اور آزادی کے حقیقی تصور کی جگمگاتی ہوئی تفسیر نگہ بصیرت کے سامنے آتی ہے اور اسی سے بدترین مخالفین اس اعتراف پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

> رسول عربیؐ اس معاشری اور بین الاقوامی انقلاب کے بانی ہیں جس کا سراغ اس سے قبل تاریخ میں نہیں ملتا۔ انہوں نے ایک ایسی عالمگیر سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا جس نے تمام کرۂ ارض کو اپنی آغوش میں سمو لیا اور جس میں عدل و احسان کے سوا کوئی دوسرا قانون کارفرما نہ تھا اس کی بنیاد تمام انسانوں کی مساوات، باہمی تعاون اور عالمگیر اخوت پر تھی۔
>
> (ریمنڈ لارنج)

تنقید و نظر

جماعت اسلامی کا تاریخ کردار

اس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، جماعت اسلامی کے کردار کو اس کے حقیقی رنگ و روپ میں سامنے لایا گیا ہے۔ اور اس طرح اس کے اس مقدس انقلاب کو اٹھایا گیا ہے جس کی اوٹ میں یہ لوگ عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ کتاب کے مؤلف لائل پور کے چوہدری حبیب احمد ہیں اور انہوں نے جماعت اسلامی کے امیر محترم ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اور دیگر اکابرین کی سینکڑوں تحریروں کے اقتباسات سے بتایا ہے کہ یہ جماعت گزشتہ تیس برس میں تحریک پاکستان، تحریک جہاد کشمیر اور دیگر اہم سیاسی اور مذہبی امور میں کس طرح ملت کے اجتماعی مفاد کے خلاف سرگرم کار چلی آرہی ہے اور اس کا اسلام کیونکر اپنی مصلحت کوشیوں اور مفاد پرستیوں کی خاطر آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ وہ تضاد بیانیاں بھی اپنے اصلی الفاظ میں منظر عام پر آگئی ہیں جو اس جماعت کے امیر اقامت دین کے پردے میں کئی سالوں سے روا رکھے ہوئے ہیں اور اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا انوکھا اسلام ہے جسے اس شد و مد سے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ مؤلف نے ان تحریروں کو یکجا کرنے میں خاصی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا ہے اور اس طرح ان لوگوں کو جو جماعت اسلامی اور اس کے امیر کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں اس زحمت سے بچا لیا ہے کہ وہ ان حضرات کی تمام کتابوں اور پمفلٹوں کے مطالعہ کی کاوش میں مبتلا ہوں۔

جماعت اسلامی، پاکستان اور اسلام دونوں کے لئے بڑے خطرے کا موجب ہے اور چونکہ روپیہ ان کے پاس بے پناہ ہے اس لئے ملک کے پراپیگنڈے کی مشینری پر انہیں قبضہ حاصل ہے۔ ان حالات میں ان کی حقیقت کو واشگاف کرنے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے وہ ملت اور اسلام دونوں کی نگاہوں میں مستحسن قرار پائے گی۔ اس اعتبار سے ہم مؤلف کی اس کوشش کو قابل مبارک باد سمجھتے ہیں۔ کتاب میں جس قدر مواد جمع کیا گیا ہے اگر اس کی ترتیب میں بھی اسی قدر کاوش کی جاتی تو کتاب کی افادیت بہت بڑھ جاتی۔ امید ہے اس کے آئندہ ایڈیشن میں وہ اس کمی کو پورا کر دیں گے۔

کتاب ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور پاکستان ٹائمز پریس نے اسے بڑے خوبصورت انداز سے شائع کیا ہے۔

اس کی ضخامت اور حسن صوری کے اعتبار سے پانچ روپے قیمت زیادہ نہیں۔

حقائق و عبر

۱۔ شاہ ولی اللہؒ کا تدبر فی القرآن

شاہ ولی اللہؒ اکیڈمی (حیدرآباد) سے شائع ہونے والے ماہنامہ "الرحیم" کی پہلی اشاعت میں مولانا عبید اللہ سندھی (مرحوم) کا مرتب کردہ شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کا تعارف شائع ہوا ہے جس میں قرآن کریم کے بعض نکات کی، شاہ صاحبؒ کی تشریحات بڑی بصیرت افروز ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں۔

(۱) آیات متشابہات

"قرآن مجید کی آیات محکمات و متشابہات کے متعلق ایک عرصہ دراز سے جو ذہنی الجھاؤ آرہا تھا شاہ صاحب نے اسے دور فرمایا۔ یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنی آیات کو محکمات اور متشابہات میں تقسیم کیا ہے اور عام طور سے اہل علم متشابہات میں بحث کرنا ناممکن سمجھتے ہیں لیکن اس ضمن میں دقت یہ ہے کہ آیات متشابہات کی کوئی ایسی متفقہ علیہ واضح تعریف نہیں جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ فلاں فلاں آیات محکمات ہیں اور فلاں فلاں متشابہات ہیں۔ جن میں کہ گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ متشابہات کے غیر معین ہونے اور ان میں بحث کو ناممکن سمجھنے کا یہ اثر ہوا کہ ایک تو سارے کا سارا قرآن قابل فہم نہ رہا۔ دوسرے متشابہات میں غور نہ کرنا ایک اصول اور عقیدہ بن گیا۔ ایک کتاب کی نسبت جب یہ عقیدہ ہو جائے کہ اس کے بعض حصے اور طرف بات یہ ہے کہ ان بعض حصوں کا تعین بھی نہ ہو، فہم سے بالاتر ہیں تو متوسط عقل رکھنے والوں کے لئے ساری کی ساری کتاب مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کی تعلیمات اور احکام کے بارے میں وہ عزم و یقین پیدا نہیں ہو سکتا جو عمل کیلئے ضروری ہوتا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اس غلط فکر کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی اور راسخین فی العلم کے لئے آیات متشابہات کے معنی کا تعین ممکن ثابت کیا۔

متوسط عقل رکھنے والے تو ہیں نہیں۔ یہاں تو حالت یہ ہے کہ "عصر حاضر کا وہ مفکر اعظم" جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے بعد آج تک کوئی ایسا مفکر پیدا ہی نہیں ہوا۔ ان کا بھی ارشاد یہ ہے کہ "آیات متشابہات" سے مراد ایسی آیات ہیں جن کے معانی میں اشتباہ ہو۔ (معاذ اللہ)۔

(ب) شانِ نزول

"قرآن مجید کا خطاب ساری انسانیت کو ہے اور اس کی دعوت میں پوری عمومیت ہے اور گو ائمہ فقہا نے اصولِ فقہ میں بالاتفاق اس امر کی صراحت کی ہے کہ اگر قرآنِ عظیم کی کوئی آیت بلفظ عموم نازل ہوئی ہو اور مفسرین اس کی شانِ نزول کے متعلق کوئی خاص واقعہ ذکر کرتے ہوں لیکن قرآنی مطالب کی تشریح میں بہرحال عمومیت ہی ملحوظ رہے گی اور کسی خاص شخص یا واقعہ سے اس آیت کو مخصوص کر دینا محلِ اعتبار نہ ہو گا۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس قاعدے پر سب کا اتفاق ہے لیکن عملاً قرآن کی آیات کو مخصوص اشخاص اور واقعات سے مختص کر دینے کا دستور ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آپ عام اساتذہ اور طلباء کو انہیں جزئی چیزوں میں غور کرتا ہوا پائیں گے قرآنِ عظیم کو عملاً آیاتِ احکام تک محدود کر دینے نیز اس کی آیات کو عمومی مطالب کے بجائے جزئی واقعات سے مختص کرنے کے اثر یہ ہوا کہ قرآن بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی زندگی میں موثر نہ رہا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ ہماری تمام عملی سرگرمیوں میں مشعلِ راہ بنتا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ محض پڑھنے پڑھانے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب "الفوز الکبیر" کی ابتداء میں اس غلطی کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ آیاتِ احکام کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ اجتماعی طور پر عام نوعِ انسان میں جو بداخلاقیاں اور بداعمالیاں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ ان آیات کا سببِ نزول ان کو سمجھنا چاہیئے۔ یہاں کسی زمانے اور قوم کی تخصیص نہیں، عرب ہوں یا عجم، آج کا زمانہ ہو یا کوئی پہلے کا گزرا ہوا دور، جہاں بھی یہ خرابیاں پیدا ہوں گی قرآن کی ان آیات کا انطباق ان پر ہو گا اس ضمن میں "الفوز الکبیر" کی عبارت ملاحظہ ہو۔ "تحقیق شدہ امر یہ ہے کہ جہاں بھی بُرے اعمال اور ظلم کا وجود ہو گا۔ وہ ان آیات کا سببِ نزول سمجھا جائے گا۔"

۲۔ اقتصادی توازن

"شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو۔ جب قوموں کو اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے، زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں لیکن اگر ان کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے حیوانی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دی جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا کسے ہوش رہے گا۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سنور گئے اور تہذیب نفس کے ذریعہ اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی تو لازمی طور سے

موت کے بعد دوسری زندگی میں اس کے لئے قبر اور حشر کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔ اخلاق کی تکمیل ہی سے جنت کا حق دار بنائے گی اور اس کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی رؤیت سے بہرہ ور ہو۔

اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لئے ایک فطری چیز بن جاتی ہے نیز جہاں نبوت نہ ہو وہاں انبیاء کے اتباع یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس طرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہ معنی ہیں "

د۔ کفر کے فتوے کا ڈر

مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں۔

"قرآن کی آیات ہی کے ضمن میں ایک اور مسئلہ ناسخ و منسوخ کا ہے۔ علماء کے نزدیک قرآن کی بعض آیات میں جو دوسری آیات کو منسوخ کرتی ہیں۔ اس مسئلہ میں مزید الجھن اس بات سے بھی ہوئی کہ اہل علم متفقہ طور پر فیصلہ نہیں کر سکے کہ قرآن مجید کی فلاں فلاں آیت منسوخ ہے۔ ایک عالم ایک آیت کو منسوخ قرار دیتا ہے اور دوسرا ہے کہ اس کی تنسیخ کا قائل نہیں۔

شاہ صاحب نے ناسخ و منسوخ کے مسئلہ کو اطمینان بخش طریقے سے حل کیا۔ انہوں نے صرف پانچ آیات کو منسوخ مانا ہے لیکن اس میں بھی ان کی حکمت ہے تاکہ مخزلی ہونے کا الزام نہ لگے۔ ورنہ ان پانچ آیات کا بھی منسوخ نہ ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں شاہ صاحب کا اصل مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید میں سرے سے کوئی آیت منسوخ ہی نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ مذہب کے اجارہ داروں نے کس طرح حق گوئی کا گلا گھونٹ رکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ جیسی شخصیت بھی یہ بات کھل کر نہیں کہہ سکتی کہ قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ انہیں بھی اس حقیقت کے اعلان کے لئے حکمت عملی سے کام لینا پڑا۔ اگر یہ گروہ جو ازل سے دین و دانش کا دشمن اور علم و بصیرت کا حریف چلا آ رہا ہے، انسانیت کے پیکر پر کابوس بن کر سوار نہ رہتا تو کیا معلوم اس وقت تک کائنات کے کس قدر رموز اور قرآن پاک کے کس قدر حقائق بے نقاب ہو چکے ہوتے۔ غور کیجئے کہ یہ لوگ علم و بصیرت کے راستے میں کتنی بڑی روک بن کر کھڑے ہیں۔

لیکن اب یہ زیادہ عرصہ تک روک بن کر کھڑے نہیں رہ سکتے۔ زمانے کے تقاضے انہیں راستے سے ہٹا کر رہیں گے۔ خوشا بخت ہیں وہ قومیں جنہوں نے اس باب میں سبقت کی ہے۔ وہ اسی نسبت سے باقی اقوام سے آگے ہیں۔

۲۔ حجاز کی مقدس سرزمین

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (جو جماعت اسلامی کے اسابقون الاولون میں سے تھے لیکن اب اس جماعت سے

الگ ہو چکے ہیں)۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد واپس آنے پر لکھتے ہیں۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

"جو تبدیلیاں میرے نزدیک لائقِ افسوس اور باعثِ تشویش ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ عام طور سے زندگی نہایت مسرفانہ ہے اور اس کے ساتھ مغربی طرزِ زندگی تیزی سے سرایت کئے جا رہا ہے۔ عیش و نشاط اور رقص و سرود سے دلچسپی اور اس میں غلو کا اندازہ بس اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہر ٹیکسی اور موٹر بس کے ساتھ ریڈیو لازماً لگا ہوا ہے اور اگر چار میل تک بھی جانا ہو تو ڈرائیور یہ تھوڑی سی مسافت بھی گانا سنے بغیر طے نہیں کرے گا۔ معلوم ہوا ہے کہ خاص کر جدہ میں اکثر بڑے لوگوں کے گھروں میں گھریلو سینما کی مشین موجود ہے۔ اور ماں اور باپ اور بچے بچیاں مل کر سینما کا شوق پورا کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اسکولوں میں خاص کر لڑکیوں کے اسکولوں میں رقص و سرود کی وبا وہاں بھی آ چکی ہے اور اس کا جو اثر زندگی و اخلاق پر پڑنا چاہیئے وہ پڑ رہا ہے۔ ان چیزوں میں دینی احساس اس حد تک کند سا ہو گیا ہے کہ حرم شریف کے قریب بازاروں میں میں نے خود دیکھا کہ پلاسٹک یا چینی کی ایسی بڑی بڑی گڑیاں جو دیکھنے میں برہنہ بچیاں معلوم ہوتی ہیں رکھی ہوئی ہیں۔ جن کا دیکھنا بھی شریف اور باحیا آدمیوں کے لئے باعثِ تکلیف ہوتا ہے۔ میرے رفیقِ سفر نے بتایا کہ مکہ معظمہ کی بعض دوکانوں پر انہوں نے ایسی فحش کتابیں بھی دیکھیں جن کی اشاعت ہندوستان میں بھی خلافِ قانون ہے۔　　(نوائے وقت ۸ جولائی)

یہ اس حجازِ مقدس کی کیفیت ہے جس کے متعلق ہمارے صالحین آئے دن ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کہ وہاں قانونِ شریعت کا نفاذ ہے۔ فحاشی اور بے حیائی کا نام تک نہیں۔ ساری سرزمین اسلامی فضا سے معمور ہے۔ سچ ہے۔

لے زر تو خدا نئی ! ولیکن　　　ستار العیوبی و قاضی الحاجاتی

باقی رہی مسرفانہ زندگی۔ تو اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب شاہ سعود کسی ملک کا سفر کرتے ہیں تو ان کا روزانہ خرچ چالیس ہزار روپے کے قریب ہوتا ہے۔ ان کی چار بیویوں اور کچھ کم نوّے لونڈیوں سے ان کے ایک سو لڑکے بیٹے اور لاتعداد لڑکیاں ہیں۔ ان کے چھبیس محل ہیں۔ ان کے پاس ایک درجن طیارے ہیں۔ اور موٹروں کی تعداد کا تو کوئی حساب نہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تیل کی رائلٹی سے شاہی خزانے کی روزانہ آمدنی ——— ایک کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کے لگ بھگ ہے"　　(نوائے وقت ۷ جولائی ۱۹۶۳ء)

۳۔ ذرا جرأت کیجئے

جماعتِ اسلامی کے ترجمان، ماہنامہ "چراغِ راہ" (کراچی) کی جون ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں مولانا محمد صلاح الحسینی صاحب

کی ایک ریڈیائی تقریر شائع ہوئی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

> "اتباعِ سنت سے بھاگنے کے لئے ایک راہ یہ بھی اختیار کی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ کی شخصیتوں میں حیثیتوں کا فرق اور امتیاز قائم کرکے ان حیثیتوں کے مختلف احکام بیان کئے گئے ہیں۔ ان منکرین اتباع کے نزدیک محمد رسول اللہ کی پیروی کے لئے اگر کوئی گنجائش نکالی جاسکتی ہے تو محمد بن عبداللہ کی حیثیت سے ان کے بہت سے نظریات اقوال اور افعال کو دینی حیثیت سے نظر انداز کرنے کی بھی گنجائش ہے۔"

یعنی ان کے نزدیک وہ شخص منکرِ سنت ہے جو نبی اکرمؐ کی رسالت کی حیثیت اور حضورؐ کی ذاتی حیثیت میں فرق کرے۔

بہت اچھا۔ اب ذرا ان اقتباسات کو ملاحظہ فرمایئے۔

> "سنت کے متعلق لوگ عموماً یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے۔ لیکن یہ بات بہت بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بہ حیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا۔ اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق وامتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جزو سنت ہے اور کون سا جز عادت، بجز اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔" (رسائل و مسائل صـ۲۱۱)

نیز یہ۔

> "جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانہ کے حالات پر جس میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔" (رسائل و مسائل صـ۳۱۶)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ صاحب مضمون کے نزدیک نبی اکرمؐ کی ایک حیثیت رسالت کی تھی اور دوسری

حیثیت شخصی اور ذاتی تھی۔ اور سنت میں صرف وہ امور آتے ہیں جنہیں حضورؐ نے بہ حیثیت رسول ادا فرمایا۔

کیا ہم "چراغ راہ" سے اس کی توقع کریں کہ وہ ان صاحب کے متعلق اعلان کر دے گا کہ یہ "منکر سنت" ہیں!

لیکن اتنا یاد رہے کہ یہ صاحب سید ابوالاعلیٰ مودودی ہیں اور مندرجہ بالا اقتباسات ان کی کتاب "رسائل و مسائل" کے صفحات ۱۱۰ اور ۲۱۷ سے لئے گئے ہیں۔

دیکھیں اب چراغ راہ کا فیصلہ کیا ہے؟

کراچی کے دوستو! آیئے اور ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے سندھ اسمبلی ہال (بندروڈ) میں مفکر قرآن پرویز صاحب کی زبان میں سنئے کہ قرآن عصر حاضر کے چیلنج کا علیٰ وجہ البصیرت کیا جواب دیتا ہے اور زندگی کے دقیق مسائل کا کس قدر واضح اور نکھرا ہوا حل پیش کرتا ہے۔

جننگ مشینری اور پرزہ جات ہر قسم

مثلاً۔ ساجن۔ رولر جن۔ پریس وغیرہ کیلئے

برہان انجینئرنگ کمپنی لمیٹڈ سیف ڈیپازٹ چیمبر

میکلوڈ روڈ ۔۔۔ کراچی

کے تجربہ سے فائدہ اٹھائیں۔

کُونُوا رَبَّانِیّٖن

(ربانی بنو)

(محترم مولانا عبدالرب صاحب کی وہ تقریر جو انہوں نے ۱۳ اپریل کی صبح کو طلوع اسلام کنونشن میں کی)

یہ سورۂ آل عمران کی آیت ۷۹ ہے مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے خواہ اسے اللہ نے کتاب۔ حکومت اور نبوت بھی عطا کی ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ سے ڈرے میری اطاعت کرو بلکہ تمہیں ربانی بننا چاہیئے۔ تم تو کتاب کی تعلیم و تدریس کرتے ہو۔ کتاب تو ہوئی وحی کے احکام تعلیم کے معنی ہیں جو کچھ معلوم ہے اسے دوسروں کو بتانا۔ تدریس کے معنی ہیں جو کچھ بتایا جائے وہ کھول کر اس طرح بتایا جائے کہ سننے والے کے دل پر نقش ہو جائے۔ بات اس طرح صاف ہو جائے جیسے گاہنے کے بعد گیہوں کے دانے صاف ہو کر بھس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جب تم اللہ کی کتاب کو اس طرح پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس کے احکام کو سمجھتے سمجھاتے ہو تو پھر کسی انسان یا انسانوں یعنی معاشرہ کے احکام کی اطاعت کے کیا معنی؟ لیکن ہو یہی رہا ہے کہ معاشرہ کی مقرر کردہ حدود کو مانا جاتا ہے اور حدود اللہ کو صرف پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔ معاشرہ کی یہ گرفت قابل غور ہے۔ معاشرہ کوئی ٹھوس شے نہیں معاشرہ تو اس ہیئت کا نام ہے جس سے لوگ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں کسی گروہ یا قوم کا جو طرز زندگی ہے وہی اس کا معاشرہ ہے۔ افراد کی ضروریات زندگی ایک دوسرے کی مدد سے پوری ہوتی ہیں۔ کسان سب کے لئے اناج پیدا کرتا ہے۔ کارخانہ دار سب کے لئے کپڑا تیار کرتا ہے۔ عمارت بنانے والے لوگوں کے لئے مکان بناتے ہیں۔ حکیم ڈاکٹر سب کے ہر مرض مرض کا علاج کرتے ہیں۔ ہمارا رہن سہن میل جول کا رہنا سہنا ہے۔ ہم سب ایک معاشرہ میں رہتے ہیں۔ معاشرہ میں سب کی ضروریات آسانی سے پوری ہوتی ہیں۔ اگر یہ انتظام نہ ہو تو ہر شخص کو اپنے کام خود کرنا پڑیں۔ خود ہی کھیتی کرے خود ہی کپڑا اپنے خود ہی گھر بنائے اور انسان جانور سے بدتر ہو جائے۔ کیونکہ جانوروں کو نہ تو کھیتی کی ضرورت ہے نہ تن ڈھانکنے کے لئے کپڑے کی۔ نہ سستانے کے لئے کسی گھر کی۔

لیکن وہ معاشرہ از خود وجود میں نہیں آجاتا۔ معاشرہ تجربہ کی پیداوار ہے۔ تجربہ نے بتایا کہ اگر لوگ مختلف کام اپنے اپنے ذمے لے لیں اور ضرورت کے سب کام آپس میں بانٹ لئے جائیں تو ایسا انتظام ہو سکتا ہے جس میں سب کی ضروریات آسانی سے پوری ہو جائیں۔ تجربہ کی بنا پر انسان نے تقسیمِ کار کا اصول اختیار کیا اور اس اصول کو عملی شکل دینے کے لئے طے کیا کہ ہر کام کرنے والا اپنی کمائی کا پورا مالک ہوگا اور کسی اور کو اس میں دست اندازی کی اجازت نہیں ہوگی۔ معاشرہ نے ذاتی ملکیت کا حق ہر فرد

آزاد معاشرہ کی خامی!

معاشرہ کو دے دیا۔ ہمارا موجودہ معاشرہ ذاتی ملکیت کے حق پر قائم ہے۔ اسے آزاد دنیا کا آزاد معاشرہ کہا جاتا ہے۔ آزاد معاشرہ میں فرد کی آزادی تو قائم رہی لیکن اس کی آزادی نے بہت بڑی مصیبت کا دروازہ کھول دیا۔ کام کرنے کی استعداد ہر شخص میں مختلف ہے اور مختلف استعدادوں کی بنا پر مختلف اشخاص کی کمائی کا مختلف ہونا لازمی ہے۔ کوئی اتنا کماتا ہے کہ خرچ کئے ختم نہیں ہوتا اور کسی کی کمائی اتنی بھی نہیں ہوتی کہ اس سے بڑی بڑی ضرورتیں ہی پوری ہو جائیں۔ نتیجہ یہ کہ معاشرہ میں چند افراد (دو چار یا زیادہ سے زیادہ دس فیصدی) تو لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے اور کم از کم ۹۰ فیصدی بھوکے، ننگے، فاقہ مست رہ گئے۔ حال ہی میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ دنیا کی آبادی کے کوئی تین چوتھائی حصہ کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ آزاد معاشرے کے اس بھیانک پہلو نے انسان کو مجبور کر دیا کہ وہ اس مصیبت

اشتراکی نظام کی خرابی

کا علاج تلاش کرے۔ بڑی کوشش اور دماغ سوزی کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ کمائیوں کے اختلافات کو ختم کر دینا چاہیئے۔ "نہ رہے بانس نہ بجے بانسری"۔ کام کرنے والوں سے کہا جائے کہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق زیادہ سے زیادہ پیدا کریں۔ اپنی محنت کے ماحصل کو حکومت کے حوالہ کر دیں۔ اور حکومت ہر شخص کی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام کرے۔ اس تبدیلی نے جہاں ضروریات کے پورا کرنے کے راستہ کو صاف کر دیا۔ وہاں فرد کی آزادی کا بھی جنازہ نکال دیا۔ نئے معاشرہ میں فرد کی حیثیت مشین کے پرزے کی سی ہو گئی۔ مشین کا ہر پرزہ اپنا اپنا کام کرتا ہے۔ کام کے قابل بنائے رکھنے کے لئے اسے تیل اور آرام دیا جاتا ہے مگر مشین کی پیداوار سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح نئے معاشرہ کا فرد کام کرتا ہے طوعاً و کرھاً۔ مگر محنت کے ماحصل سے اسے واسطہ نہیں ہوتا۔ کام کے قابل بنائے رکھنے کے لئے حکومت اس کے نان نفقہ کا بندوبست کر دیتی ہے۔ نیا معاشرہ اشتراکی دنیا کا اشتراکی معاشرہ کہلاتا ہے۔ اشتراکی معاشرہ روٹی تو دیتا ہے مگر فرد کی انسانیت ختم کر کے اسے جانور بنا دیتا ہے۔

نظامِ ربوبیت

جس طرح آزاد معاشرہ (یعنی ہمارا موجودہ معاشرہ) سمجھ بوجھ اور انسانی تجربہ کی بنا پر قائم ہوا تھا اسی طرح اشتراکی معاشرہ کی بنیاد میں بھی انسانی عقل کارفرما ہوئی ہے۔ لیکن دونوں معاشرے انسانیت کش خرابیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ عقل کی روشنی کے علاوہ اسے ایک اور روشنی بھی ملی ہے۔ یعنی وحی کی روشنی۔ وحی نے معاشرہ کی جو بنیاد تجویز کی ہے وہ عقل کی تجویز کردہ بنیادوں سے مختلف ہے۔ وحی کی تجویز کردہ بنیاد پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے ساتھیوں نے جو معاشرہ قائم کیا تھا اس میں نہ تو مختلف استعدادوں کی بنا پر

دولتمند طبقہ پیدا ہوا نہ لوگ تنگ بھوکے رہے۔ نہ انسانی آزادی سلب ہوئی اور نہ انسان مشین کا بے جان پرزہ بنا۔ وحی کی تجویز کردہ بنیاد ہے۔ "ربوبیت" وہ ربوبیت جس کا پیامبر ہے طلوع اسلام! اور جس کی دعوت سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت میں دی گئی ہے۔ "کونوا ربانیین" ربانی بنو۔

ربوبیت اس فعل کو کہتے ہیں جس میں (مثلاً) بیج کو پورا درخت بننے میں مدد دی جاتی ہے۔ زمین کو درست کرنا۔ پودے کو پانی دینا۔ اسے کیڑوں مکوڑوں سے بچانا۔ اس کی کانٹ چھانٹ کرتے رہنا۔ اس کی صحت اور تندرستی کا خیال رکھنا۔ اسے کھانا پڑھانا وغیرہ۔ بس یوں سمجھئے کہ کسی چیز کو اس کی ننھی سی ابتدا سے دیکھ بھال کے ذریعہ اس کے معراج تک پہنچا دینے کا نام ربوبیت ہے۔ اور ربانی وہ انسان ہے جس کی ذہنیت یا افتادِ طبیعت کا غالب پہلو ربوبیت ہو۔ جسے ہر وقت یہ فکر دامنگیر ہو کہ ہر بڑھنے والی چیز اور ہر وہ چیز جس میں بڑھنے کی صلاحیت ہو اسے آگے بڑھنے میں جہاں تک ہو سکے مدد دے اگر یہی ذہنیت معاشرہ کی ہو جائے تو وہ معاشرہ ربانی کہلائے گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم کردہ معاشرہ "ربانی معاشرہ" تھا۔

"کونوا ربانیین" کا عملی مطلب یہ ہے کہ طبیعت کو ایسا بناؤ کہ ہر فرد بلکہ پورا معاشرہ، افرادِ معاشرہ کو بہتر انسان بنانے میں تن من دھن سے ہمہ وقت آمادہ ہو۔ لیکن ایسی آمادگی طبیعت میں یوں ہی خود بخود پیدا نہیں ہو جائے گی بلکہ معاشرہ کی تشکیل میں جتنے امور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ان سب کو وحی کی روشنی میں دیکھنے سمجھنے اور اختیار کرنے سے وہ آمادگی پیدا ہو گی۔

معاشرہ کی عمارت جن بنیادوں پر اٹھتی ہے ان میں سے اہم ترین کام ہیں کام کی استعداد۔ کام کی اُجرت۔ اُجرت میں سے بچت کا استعمال۔ وحی نے ان سب پر روشنی ڈالی ہے۔

افرادِ معاشرہ کی ذمہ داریاں

معاشرہ کا بنیادی مقصد ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا ہے۔ یہ وہی بات ہے جسے قرآن کریم نے رزق کا حاصل کرنا کہا ہے۔ ہر انسان اپنی جان کا خود ذمہ دار ہے۔ "علیکم انفسکم" (۵/۱۰۵) اور ہم و جان کو قائم رکھنے کے لئے تلاشِ رزق ضروری ہے تاکہ کھانا، کپڑا، گھر وغیرہ کی ضروریات پوری ہوں۔ قرآن کریم نے کہا ہے "فَابْتَغُوا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ" (۲۹/۱۷) رزق تلاش کرو۔ دوسری جگہ رزق کو فضل کہا ہے "وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" (۶۲/۱۰) اللہ کا فضل تلاش کرو۔ اسلئے وحیٔ خداوندی کے مطابق ہر شخص کو رزق حاصل کرنے کے لئے کام کرنا چاہیئے۔ جو شخص خود کام نہ کرے اور دوسروں کی کمائی پر جئے اسے قرآن نے مترف کہا ہے۔ سورۂ واقعہ میں ہے کہ مترفین اصحاب الشمال میں سے ہیں۔ جن کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ "اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ" (۵۶/۴۵) سورۂ فتح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی خصوصیات میں سے ایک یہ بتائی ہے کہ "يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا" (۴۸/۲۹) وہ اللہ کا فضل تلاش کرتے ہیں اور تلاشِ رزق میں وہ طریقہ اختیار کرتے ہیں جو اللہ کو پسند ہے۔ قرآنی معاشرہ میں ہر تندرست شخص مفید کام کرے اور مفید کام وہ ہے جو سارے انسانوں کے لئے فائدہ مند ہو۔

مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ" (۱۳/۱۷) ساری انسانیت کے فائدے کے کام ہی کو بقا ہے۔

ذات کی نشوونما

آزاد اور اشتراکی دونوں معاشرے جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کو مقصود و منتہائے زندگی سمجھتے ہیں۔ وحی خداوندی نے کہا ہے کہ جسم کی ضروریات بے شک پوری کرو۔ لیکن اپنے نفس یعنی انسانی ذات کو نظرانداز مت کرو۔ انسانی ذات کی نشوونما نہ کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے "قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا" (۹۱/۱۰) جس نے اپنی ذات کی نشوونما کی وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ تباہ و برباد ہوا۔ سورۂ تحریم میں ہے۔ "قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا" (۶۶/۶) اپنی ذات اور اپنے اہل کی ذات کی نگہداشت کرو آگ سے یہ وہ آگ ہے جس کی تکلیف جسم کو نہیں جسم والے کو یعنی اس کی ذات کو ہوگی۔ جس طرح قتل کی سزا تلوار کو نہیں تلوار چلانے والے کو دی جاتی ہے۔ وحی خداوندی کے مطابق ہر شخص کو جسم کی پرورش کے ساتھ ساتھ ذات کی نشوونما بھی کرنی ضروری ہے۔

ضروریات زندگی کی اہمیت

زندگی کے کام بھانت بھانت کے ہیں۔ کوئی مٹی کھودتا ہے۔ کوئی مکان بناتا ہے۔ عمارت بنانے میں جہاں راج اور بڑھئی چاہئیں وہاں انجینئر اور نقشہ بنانے والے بھی درکار ہیں۔ ہاتھ پیر سے جسمانی کام کرنے والے اور سمجھ بوجھ سے دماغی کام کرنے والے اور ان میں بھی مختلف استعداد والوں کے بغیر گذارہ نہیں۔ استعداد کے اختلاف کا مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے مختلف کام حسن و خوبی سے پورے ہوتے رہیں۔ "وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ" (۱۶/۷۱) اللہ نے اکتساب رزق کی استعداد میں بعض کو بعض سے بہتر بنایا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ استعداد کے کم زیادہ ہونے سے محنت کی اُجرت بھی کم زیادہ ہو جائے گی۔ محنت میں تو سب برابر ہیں۔ زندگی کے آٹھ گھنٹے سب کے سب صرف کرتے ہیں لیکن انہیں محنت کے قابل بنائے رکھنے کے لئے ان کی ضروریات کی تشکیل میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ جسمانی کام کرنے والے کے لئے ایک وقت میں آدھ سیر آٹا بھی ناکافی ہوتا ہے جب دماغی کام کرنے والا بمشکل آدھ پاؤ کھا سکے گا۔ پہلے کو زمین کے بچھونے پر شور و شغب میں جیسی گہری نیند آتی ہے دوسرے کو نرم و گرم بستر پر اور سکون کے عالم میں بھی ویسی نیند نصیب نہیں ہوتی۔

محنت اور استعداد

قرآن کریم نے محنت اور استعداد کے فرق کو نہایت لطیف انداز سے سمجھایا ہے۔ بات قارون کے اس قول سے شروع ہوتی ہے۔ "إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي" (۲۸/۷۸) میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے لیکن کمائی منحصر ہے دو چیزوں پر (۱) محنت اور (۲) کمائی کی استعداد۔ صبح سے شام تک کرنے والے سب محنت یکساں کرتے ہیں مگر استعداد کے فرق کی بنا پر ان کی کمائیاں کم زیادہ ہو جاتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ استعداد کے فرق کی وجہ سے کمائی میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ کس کا حق ہے؟ محنت تو انسان کی اپنی ہے لیکن جس استعداد سے کام کرتا ہے وہ انسان کی پیدا کردہ نہیں ہے وہ اسے اللہ نے بطور انعام دی ہے۔ لہذا محنت کی اُجرت تو انسان کا حق ہے لیکن استعداد کی اُجرت اس کا حق نہیں ہو سکتا۔ یہ حق ہے اللہ کا یعنی اس کی حاجت مند مخلوق کا۔ ذہنی استعداد کا تعلق دماغ سے ہے جو انسان خود کہیں سے نہیں لاتا۔ بلکہ اسے پیدائشی طور پر ملتا ہے۔ دماغ کو جلا دینے والے اسباب ہیں بچپن کا ماحول۔

تعلیم و تربیت اور دماغ کے استعمال کے مواقع۔ اور یہ سب اسباب بھی انسان کے اپنے بس کے نہیں بلکہ سب معاشرے سے متعلق ہیں۔

سورۂ واقعہ میں کئی مثالوں سے اللہ نے اس حق کو سمجھایا ہے۔ کھیتی۔ پانی اور آگ کی مثالیں دے کر قرآن پوچھتا ہے کہ زمین میں ہل چلا کر بیج تو تم ڈالتے ہو لیکن کیا بیج میں سے پودا اُگا کر کھیتی کو پروان بھی تم ہی چڑھاتے ہو؟ کھیتی کو پانی تو تم دیتے ہو۔ لیکن کیا بادلوں سے پانی کو بھی تم ہی برساتے ہو؟ آگ تو تم سلگاتے ہو لیکن اس کا ایندھن بھی تمہارا ہی پیدا کردہ ہے؟ ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ کھیتی کو پروان چڑھانا۔ بادلوں سے پانی برسانا اور ایندھن کے لئے درختوں کا پیدا کرنا انسان کے بس کا نہیں۔ یہ سب کام اللہ کے حکم اور قانون سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا بہتر استعداد والے کی زیادہ کمائی ان کا حق ہے۔ جن کی کمتر استعداد کی وجہ سے کمائی کم ہوتی ہے۔

کام کی اُجرت میں انسان کا حق صرف اتنا ہے جتنی اس نے محنت کی ہے۔ محنت کے معاوضے سے زائد جو کچھ بہتر استعداد کی وجہ سے حاصل ہو وہ اس کا حق نہیں۔ "لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ" (۵۳/۳۹)۔

کمائی کا ایک پہلو خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ کمائی محنت سے بھی ہوتی ہے۔ اور بے محنت بھی۔ بے محنت کی کمائی کی مثالیں ہیں کمپنیوں کے حصوں کا منافع۔ بزرگوں کا ترکہ۔ عقیدت مندوں کی نذریں۔ کاروبار میں زائد منافع خوری۔ مکانوں کا کرایہ سود وغیرہ۔ قرآنی معاشرہ میں صرف محنت کی کمائی تسلیم کی جاتی ہے۔

ضرورت سے زائد کمائی میں سے بچت کا مسئلہ نہایت اہم ہے کیونکہ سرمایہ داری کا سارا نظام اسی بچت کی بنیاد پر ہے۔ بچت اور خرچ میں گہرا تعلق ہے۔ قرآن کریم نے خرچ اور بچت دونوں کے بارے میں ہدایت دی ہے۔ قرآن کریم کے مطابق ضروریاتِ زندگی پورا کرنے میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ کوئی پیسہ بلا ضرورت خرچ ہو اور نہ ضرورت سے زیادہ۔ دوسرے یہ کہ تبذیر اور اسراف سے بچتے ہوئے خرچ کرنے کے بعد اگر کمائی میں سے کچھ بچ جائے تو بچت کو استعمال کیسے کیا جائے۔ عام طور پر بچت کو کل کی ضرورت کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جہاں کل کی ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام نہ ہو وہاں بچت کو محفوظ رکھنا درست ہے۔ لیکن جہاں اسے پورا کرنے کا انتظام ہو وہاں اسے دوسروں کی حاجتوں کو پورا کرنے کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ وحیٔ خداوندی نے بتایا ہے کہ جس قدر ضروریات سے فاضل ہو اس سب کو حاجت مندوں کے لئے کھلا رکھو۔ قرآن کریم نے اس سوال کا جواب کہ "مَاذَا يُنفِقُونَ" (کتنا کھلا رکھیں) یہ دیا ہے کہ "العفو" (۲/۲۱۹) یعنی سب کا سب۔

آزاد معاشرہ۔ اشتراکی معاشرہ اور قرآنی معاشرہ کے خدوخال مختصراً آپ کے سامنے آگئے۔ سمجھ یہ کہتی ہے کہ موجودہ آزاد معاشرہ کی جگہ قرآنی معاشرہ آجائے اور جب قرآنی معاشرہ آگیا تو اشتراکی معاشرہ کی کشش خود بخود ماند پڑ جائے گی۔ معاشرہ کی تبدیلی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے منظم اور مسلسل کوشش چاہیئے۔ پاکستان کا اولین مقصد اسی تبدیلی کا پیدا کرنا ہے۔ کاش وہ اس کے لئے اجتماعی کوشش جلد شروع کرے۔ اہم سوال یہ ہے کہ نظامِ ربوبیت کے خواہاں لوگ، یعنی ہم خود موجودہ

معاشرہ کو قرآنی معاشرہ میں تبدیل کرنے کے لئے فرداً فرداً کیا کرسکتے ہیں؟ سوال کا مجمل جواب ہے: "اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) یعنی ہم اپنی ذہنیت کو بدلیں اور اسے قرآنی بنائیں۔ ذہنیت بدلنے کے طریقے کے مختلف اجزاء یہ ہیں کہ (۱) قرآنی معاشرہ کی خصوصیات کو ہم خود اچھی طرح سمجھیں اور انہیں اپنائیں۔ ان میں سے بنیادی خصوصیات یہ ہیں:۔ ہر شخص حسب استعداد پوری محنت سے کام کرے۔ محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات پورا کرنے میں کوئی پیسہ بلا ضرورت خرچ نہ ہو اور نہ ضرورت سے زیادہ۔ محنت کے ماحصل میں سے جو کچھ فالتو بچے اسے آس پاس والوں کی ضروریات پورا کرنے میں لگائے۔ اسی سے طبیعت ربانی بنتی ہے۔ کام بھی وہ کرے جس میں سارے انسانوں کا فائدہ ہو۔ روزمرہ کی زندگی میں جذبات اور عقل کے پیچھے اندھا دھند نہ چلے۔ بلکہ ہر فیصلہ قرآنی اصولوں کو سامنے رکھ کر کرے۔ ہر وقت خیال رکھے کہ مر کر جسم خاک میں مل جائے گا اور اس کی "میں" یا "ذات" موت کے بعد جیتی رہے گی جہاں کا جینا یا تو انتہائی سکھ کا ہوگا یا انتہائی دکھ کا۔ اس لئے جسم کی پرورش کے ساتھ ساتھ ذات کی نشوونما بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ زندگی میں سکھ ہی سکھ ہو۔ ذات کی نشوونما کا واحد طریقہ قرآنی اصولوں پر قائم رہنا ہے۔ جن میں ایک اصول تعاون ہے۔ یعنی سب سے مل جل کر معاشرہ میں رہنا۔

(۲) قرآنی معاشرہ کی خصوصیات اوروں کو سمجھا کر انہیں اپنا ہم خیال بنائیں۔

(۳) نئی پود کو سکولوں اور کالجوں میں قرآنی معاشرہ کی تفاصیل بتانے کا انتظام کریں۔

(۴) قرآنی معاشرہ کی تفصیلات کو مخصوص لوگوں کے سامنے لانے کی خاص کوشش کی جائے۔ مثلاً قانون ساز اسمبلیوں کے اراکین۔ اسلامک آئیڈیالوجی کونسل کے ممبران۔ حکومت کے ذمہ دار افسر۔ تجارت پیشہ اصحاب اور ان سب سے اہم وہ گروہ جو مساجد میں تقریریں کیا کرتے ہیں۔

ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ اگر ان باتوں کو اپنائے تو موجودہ معاشرہ میں تبدیلی پیدا کر کے قرآنی معاشرہ کے قیام کے لئے فضا سازگار ہو جائے گی۔

مُفت

دوا برائے دمہ، درد گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ:-

شیخ آئی ایس نیکڑی

متصل گنیش کھوپرا ملز۔ لارنس روڈ

(کراچی)

نوٹ: جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

رابطہ باہمی

لندن بزم کے رفیق کار طلبا کے سالانہ امتحانات کے باعث اس بار ماہانہ اجتماع کو ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بجائے بریڈفورڈ (BRADFORD) میں ایک بہت بڑے اجتماع کا اہتمام کیا گیا۔ اس اجتماع کی کامیابی کا سہرا وہاں کے مقامی رفیق کار محترم دین محمد صاحب اور ہڈرس فیلڈ کے شیدائی قرآن محترم یوسف بٹ صاحب کے سر ہے۔ ان احباب کی مساعی جمیلہ سے اس اجتماع میں بریڈفورڈ کے علاوہ ہڈرس فیلڈ اور لیڈز سے بھی بہت سے احباب نے شرکت کی۔ "ثواب" کے موضوع پر پرویز صاحب کا اہم درس ٹیپ ریکارڈ پر سنایا گیا اور اس کے بعد تحریک طلوع اسلام کے اغراض و مقاصد سے حاضرین کا تعارف کرایا گیا۔ یہ سب کچھ انتہائی توجہ، ذوق و شوق اور انہماک سے سنا گیا۔ اور صحیح تاثر کا ایک سماں بندھ گیا۔ وہ دن دور نہیں جب بریڈفورڈ کی رفتار کی سرگرم کوششوں کے باعث شمالی اور وسطی انگلستان میں قرآن کی آواز فردوس گوش بنتی سنائی دے گی۔ اور بریڈفورڈ اور ہڈرس فیلڈ کے عظیم شہر ہماری تحریک کے گہوارے بن جائیں گے۔

تحریک نے اب جنوب مغربی انگلستان (WALES) کے عظیم تجارتی اور صنعتی شہر کارڈف (CARDIFF) کی طرف رخ کیا ہے وہاں محترم مختار احمد صاحب مختار نے اس مقصد کے لئے اعلیٰ قسم کا ٹیپ ریکارڈ خرید کر لیا ہے اور بہت جلد انگلستان کے اس علاقہ میں بھی طلوع اسلام کی قرآنی آواز کو بخشی سنائی دے گی۔

کراچی قرآنی فکر کی اشاعت و تبلیغ کے سلسلے میں بزم اپنی درخشندہ روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ سندھ اسمبلی ہال میں ہر اتوار کی صبح ۹ بجے پرویز صاحب کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ باقاعدگی سے شروع ہوتا ہے اس ہفتہ وار اجتماع کی حاضری دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور اسے بیش از بیش کامیاب بنانے کے لئے کافی اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس اجتماع کے اختتام پر ضروری لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔

۶ جولائی کو بزم کا خصوصی اجلاس حاجی احمد حاجی اسمٰعیل کے دولت کدہ پر ہوا۔ اس اجلاس میں دیگر اہم امور کو زیر

غور لانے کے علاوہ حاجی صاحب موصوف کے دولتکدہ پر سٹڈی سرکل کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔

بزم کا آئندہ اجلاس نمائندہ بزم شیخ محمد شفیع صاحب کے مکان (2 / 265 مل سٹریٹ کراچی) پر ۱۱ اگست کو ۵½ بجے شام منعقد ہوگا۔

لاہور

بزم زندگی اور جدوجہد کا پورا ثبوت دے رہی ہے۔ اس کا گزشتہ اجلاس میاں عبدالخالق صاحب کے دولتکدہ پر ہوا۔ اس اجلاس میں محترم جناب پرویز صاحب اور کراچی سے ڈاکٹر شمس الدین اور شیخ محمد الوھاب صاحب نے خصوصی مہمان کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ بزم نے فیصلہ کیا کہ پرویز صاحب کے درس قرآن کے سلسلے میں طلوع اسلام اسپیشل بس کے کم از کم آئندہ ایک سال تک کے اخراجات کا ابھی سے انتظام کر لیا جائے۔ بزم نے ادارہ کی طرف سے شائع کردہ مختلف پمفلٹس ایک ایک ہزار کی تعداد میں خریدنے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی طے پایا کہ مفکر قرآن کے عائلی قوانین سے متعلق ۱۴ جولائی کے درس قرآن کے اجتماع کو شایان شان طور پر کامیاب بنانے کے لئے پبلسٹی کمیٹی کے تعاون سے کما حقہ نشر و اشاعت سے کام لیا جائے۔ اجلاس کا اختتام محترم پرویز صاحب کے مختصر لیکن انتہائی بصیرت افروز خطاب سے ہوا۔

کوئٹہ

بزم کے ہفتہ وار اجتماعات کامیابی سے جاری ہیں۔ بزم نے اپنے لئے ٹیپ ریکارڈر کا بندوبست کر لیا ہے اور اس طرح پرویز صاحب کے درس قرآن کو سنانے کا پورا انتظام ہو گیا ہے۔ اجلاس کا اعلان پہلے سے مقامی اخبارات میں شائع ہوتا ہے۔ اور اس طرح اتوار کے یہ اجتماعات بڑی کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ ٹیپ کے ذریعہ پرویز صاحب کے درس قرآن نے یہاں عوام میں تحریک سے بڑی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ اور اہل علم طبقہ اس سے بالخصوص متاثر ہو رہا ہے۔ درس کے اختتام پر تحریک کا لٹریچر بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔

پنڈ دادن خاں

بزم سرگرم عمل ہے۔ حافظ عبدالمجید صاحب بزم کے نئے نمائندہ مقرر ہوئے ہیں۔

بستی برمانی

دور افتادہ بستی کی یہ ننھی سی بزم قدامت پسندی اور اسلاف پرستی کے دیہاتی ماحول میں فکر قرآنی کا ننھا سا دیا روشن کئے ہوئے ہے۔ درگاہ حضرت امام شاہؒ میں ایک اجلاس عام کا اہتمام کیا گیا۔ اور دیگر قرآنی نکات کے علاوہ کتاب و سنت کے نازک فرق کو بھی حاضرین کے ذہن نشین کیا گیا۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے فضا سازگار ہو رہی ہے۔

لاہور چھاؤنی

بزم کے ہفتہ وار اجتماع باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ اس موقع پر پرویز صاحب کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا جاتا ہے اور بعد میں پمفلٹس تقسیم کئے جاتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے افق سے قرآنی فکر کی جلوہ باریاں

ڈھاکہ میں بزم طلوع اسلام کا قیام

ڈھاکہ للّٰہ الحمد کہ ڈھاکہ کے منتشر احباب اپنی بزم کی تشکیل کے قابل ہو گئے اور انہوں نے مشرقی پاکستان کے دارالسلطنت میں قرآنی فکر کی اجتماعی نشر و اشاعت کا مسئلہ خوش اسلوبی سے حل کر لیا۔ اس سلسلے میں محترم شہاب الدین احمد کے دولت کدہ پر احباب کا پہلا اجتماع ہوا۔ اور بزم کی تشکیل کے بعد محترم عبدالحلیم صاحب نمائندہ منتخب کر لئے گئے اور ان کی سرکردگی میں تمام احباب پورے ذوق و شوق سے اس مقصد عزیز کے لئے شاد و بشاد سرگرم کار ہو سکیں گے۔ محترم شہاب صاحب کی کوششوں سے پرویز صاحب کے درس قرآن کے ٹیپ حسب ضرورت میسر آ گئے ہیں اور اس طرح قرآن کی دعوتِ انقلاب یہاں اپنی روشنی پھیلا رہی ہے۔ محترم عبدالحلیم صاحب کے مضامین بھی یہاں کے انگریزی اور بنگالی جرائد میں شائع ہو رہے ہیں اور نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ان سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ بزم نے ادارہ طلوع اسلام کے شائع کردہ لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں عوام تک پہنچانے کا عزم کیا ہے۔

اس حسنِ آغاز کے بعد مشرقی پاکستان میں تحریک کا مستقبل بے حد روشن نظر آ رہا ہے۔

اعلانِ توثیق ادارہ انتہائی مسرت سے بزم ڈھاکہ کے قیام کی توثیق کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں اس اولین بزم کی ذمہ داری جن احباب نے اپنے ہاتھوں میں لی ہے ان سے ہماری بہترین امیدیں وابستہ ہیں۔ خدا کرے بزم ڈھاکہ کا قیام پورے مشرقی پاکستان میں قرآنی انقلاب کا حرفِ آغاز ثابت ہو۔

موت کا آہنی پنجہ

ہم سے دو اور قرآنی احباب چھین کر لے گیا۔ میرزا معراج الدین صاحب ریٹائرڈ ایم۔ ڈی میرزا کے نام سے متعارف تھے، احباب کے جانے پہچانے تھے۔ ان کا تعلق ایک گھرانے سے تھا جس کی فضا میں مدتوں سے قرآن کی آواز گونجتی چلی آ رہی تھی اس لئے انہیں قرآن کریم سے بے پناہ شغف تھا۔ محکمہ ڈاک اور تار کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت ایسی تھی جس میں اکثر دورے پر جانا پڑتا تھا۔ ان دوروں میں وہ اپنے فرائضِ منصبی سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی سفارت کا فریضہ بھی ادا کرتے۔ قرآن پیش کرنے کا انداز بڑا دلنشیں تھا۔ صحت ایسی اچھی کہ ہر ایک دوست کو احتیاط اور ورزش کا مشورہ دیتے رہتے لیکن خود اچانک ہی چل بسے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا کرے۔

چلتے ہوئے دوسرے ساتھی جو ہم سے جدا ہو گئے سونت ہو (تحصیل صوابی ضلع مردان) کے مولانا عبدالحکیم تھے۔ بزم مردان کے نمائندہ خان عبدالحکیم خان ان سے الگ ہیں خدا انہیں تادیر سلامت رکھے۔ مولانا مرحوم قرآن کے سچے شیدائیوں میں سے تھے۔ بڑے مخلص دوست اور خاموش کام کرنے والے۔ قرآنی فکر سے ان کا تعلق بڑا قدیمی تھا اور دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا۔ ان کی وفات سے اس حلقے میں بڑی کمی واقع ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا کرے۔

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
(اقبالؒ)

اِحتساب

(۱۰)

عرب نیشنلزم کا فتنۂ عظیم

عرب ممالک (مصر، سعودی عرب وغیرہ) میں عرب نیشنلزم کی تحریک جس زور شور سے اُبھری ہے وہ وحدتِ اسلامی کے خلاف کتنا بڑا فتنہ ہے اس کا احساس ہر مخلص مسلمان کو ہے۔ یہ فتنہ عرب ملکوں میں پورے زور شور سے جنم لے رہا ہے۔ چنانچہ طلوعِ اسلام نے اس کے عواقب کا تجزیہ کرتے ہوئے مسلمانانِ عالم کو پھر وحدتِ امت کے دینی تصور کا احساس دلایا۔ فروری ۱۹۵۶ء کے مقالہ افتتاحیہ میں اس نے قرآن کے عطا فرمودہ تصورِ قومیت کی وضاحت کے بعد لکھا۔

> ہمارے عرب بھائی جنہیں آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ کہا گیا تھا کہ اخوت کا مدار ایمان (آئیڈیالوجی) کا اشتراک ہے، نسل کی بنیادوں پر وحدت کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ کیا دنیا میں کسی قوم کی اس سے بڑھ کر کوئی اور بدبختی بھی ہو سکتی ہے کہ جن تباہ کن تصورات کو دنیا اپنے ناکام تجربات اور ہلاکت انگیز مشاہدات کے بعد اس طرح مردود قرار دے دی ہو وہ قوم ان تصورات کو مژگانِ عقیدت سے اٹھا کر اپنے سر آنکھوں پر رکھے ....
>
> لیکن تماشا یہ ہے کہ عربی ممالک خالص غیر قرآنی بنیادوں پر اپنے اندر وحدت آفرینی کی مذموم کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی دیگر مسلم ممالک سے توقع رکھتے ہیں کہ انہیں اسلام کا پیامبر، اور "حرمین شریفین کا خادم" ہونے کے اعتبار سے واجب الاحترام سمجھیں اور ان کی دینی قیادت کو قبول کریں۔ ... اگر عرب ممالک فی الواقعہ اسلام کے پیامبر اور قرآن کے علمبردار ہوتے تو مسلمانانِ عالم کے نزدیک ان کی قیادت و سیادت مسلّم رہتی۔ انہوں نے قرآن کا دامن چھوڑ دیا اب اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان انہیں "نسلی برہمن" سمجھ کر ان کی پوجا کریں تو وہ جتنی جلدی اس خیالِ خام کو دل سے نکال دیں، اتنا ہی اچھا ہے۔ برہمن تو اب اپنے دیس (ہندوستان) میں بھی نہیں پوجا جا سکتا کہ لوگ "بدیسی برہمنوں" کو پوجیں۔
>
> (لمعات شمارہ فروری ۱۹۵۶ء ـ صـــ)

اس حقیقت کی نقاب کشائی کے بعد طلوع اسلام ایک اور داستان غم کو سامنے لاتا ہے اور وہ عرب ممالک کے ان پیشوایان مذہب کی داستان ہے جو اسلام کے بنیادی تصور قومیت کے خلاف عرب نسل پرستی کے فتنے کو ابھرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

> حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ ان ممالک میں بڑے بڑے "علمائے کرام" موجود ہیں۔ جامعہ ازہر جیسی مذہبی درسگاہ بھی ہے۔ مکہ اور مدینہ، بغداد اور دمشق جیسے اسلامی مراکز بھی ہیں لیکن کیا مجال جو ان علاقوں میں سے کسی ایک سے بھی یہ آواز بلند ہوئی ہو کہ نسل پرستی کی بنا پر وحدت کا یہ تصور یکسر غیر اسلامی اور خالصتہً طاغوتی ہے۔ جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہماری فلاں بات غیر اسلامی ہے تو اب تک اس کے خلاف کسی نے آواز کیوں نہ اٹھائی، وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ سیاست کی مصلحت کوشیاں کس طرح ارباب مذہب و شریعت کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگا دیتی ہے۔
> اس باب میں خود ہمارے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۴)

مسئلہ کشمیر کا حل

انہی دنوں کشمیر کا مسئلہ پھر سلامتی کونسل میں پیش ہوا اور استصواب رائے کے سابق فیصلے کی تصدیق و تائید کے بعد کونسل کا اجلاس برخاست ہو گیا۔ اس مسئلہ کی اہمیت سلامتی کونسل کے تساہل اور پاکستانی لیڈروں کی بیان بازیوں کے غیر موثر اقدامات پر روشنی ڈالتے ہوئے طلوع اسلام نے ملت پاکستان پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس مسئلہ کا حل دوسروں کے ہاں سے نہیں ملے گا بلکہ اسے ملت کی قوت عزم کے بل بوتے پر ہی کما حقہ طے کیا جا سکے گا اس سلسلے میں اس نے لکھا۔

> کشمیر کے مسئلہ کا حل ہمیں اپنے اندر سے مل سکے گا باہر سے نہیں۔ جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے وہ ہماری اس کمزوری کا نتیجہ ہے جو ہم نے متارکہ (CEASE FIRE) کا فیصلہ کرتے وقت دکھائی قوموں کی تاریخ میں ہوتا یہ ہے کہ
>
> یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد
>
> لہٰذا اس کے ازالہ کی اب ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اگر صیانتی مجلس اس باب میں فی الحقیقت موثر اقدامات نہیں کرتی تو ہمیں خود آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ اس کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم نے بھارت سے ثقافتی اور تجارتی قسم کے جس قدر معاہدے کر رکھے ہیں انہیں فسخ کر دیا جائے پھر ان سے ڈپلومیٹک تعلقات منقطع کر لئے جائیں اور اس کے بعد ان سے کہا جائے کہ چونکہ متارکہ (CEASE FIRE) کا فیصلہ استصواب کے لئے ہوا تھا اور تم نے استصواب کا کوئی

امکان نہیں رہنے دیا اس لئے مجبوراً ہم اس معاہدے کو منسوخ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی طرف سے جو ردِ عمل ہو اس کا ہمیں مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ (ایضاً ۔ ص ۷)

قومی تقدیر کے پاسبان

مئی ۱۹۵۸ء کے لمعات میں "طلوع اسلام" نے پاکستان کی گزشتہ دس برس کی تاریخ کا بھرپور جائزہ لیا۔ ہماری قومی کشتی کے ناخدا اس مدت میں کیا کچھ بنانے اور بگاڑنے میں سرگرم کار رہے اس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے اس نے صوبائی اور مرکزی وزرائے کرام کی قومی خدمات کی تصویر بایں الفاظ پیش کی۔

مملکت سے نیچے اتر کر حکومت کی طرف آیئے تو وہاں اور ہی تماشا دکھائی دے گا۔ آپ (صوبائی یا مرکزی حکومت کے) کسی منسٹر کے کسی ایک ماہ کے پروگرام کا تجزیہ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے کتنا وقت صرف کرتا ہے اور اپنی کرسی کے محفوظ رکھنے کی دوڑ دھوپ کے لئے کتنا؟ آپ دیکھیں گے کہ اپنے فرائض پر توجہ دینے کے لئے اسے دن بھر میں بہ مشکل چند لمحات ملیں گے۔ باقی سارا وقت اسی اُدھیڑ بن میں صرف ہو جائے گا کہ ان کی پارٹی کی منسٹری کس طرح قائم رہے اور اس میں ان کی اپنی پوزیشن کیسے مستحکم ہو! جب صورتِ حال یہ ہو تو پھر ملک کے نظم و نسق کی جو حالت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

(شمارہ مئی ۱۹۵۸ء ۔ ص ۵)

ملک کے ارباب بست و کشاد مغربی پاکستان کے لئے جداگانہ انتخاب اور مشرقی پاکستان کے لئے مخلوط طریق انتخاب کا مضحکہ خیز فیصلہ کر کے مصلحت کوشیوں کی جس راہ پر دوڑ رہے تھے اس کا ماتم کرتے ہوئے طلوع اسلام نے ملک کے عوام سے سچا یقین و اعتماد وابستہ کیا اور واضح کیا کہ

ہمیں اپنے عوام پر پورا اعتماد ہے کہ وہ تحریک پاکستان کے دوران میں بھی اسلامی مطالبہ کے بدل حامی تھے اور اب بھی ایک صحیح اسلامی معاشرے کا قیام دل سے چاہتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم نے ان کی تعلیم و تربیت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ نہ ہی اس تصورِ پاکستان کے زندہ رکھنے اور عام کرنے کا کوئی انتظام کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس تصور کو عام اور اس سے فضا کو اس طرح معمور کر دیا جائے کہ ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اسے جذب کرتا جائے تو آج بھی اسلام کا رشتہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ایک مستحکم وحدت اور یگانگت کا موجب

اور مغربی پاکستان میں سندھی اور پنجابی کے امتیاز کو مٹا کر ملی برادری کا محکم ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمارے اجتماعی ایمان کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس میں ہماری نجات وسعادت کا راز مضمر ہے۔ اسی سے پاکستان کا استحکام وابستہ ہے اور یہی ہمارے تمام دکھوں کا واحد علاج ہے۔ جن لوگوں نے پاکستان کو اس لئے حاصل کیا تھا کہ یہ اسلام کی تجربہ گاہ بن سکے، ان کے کرنے کا کام یہی ہے کہ اس تصور کو زیادہ سے زیادہ حد تک عام کیا جائے۔ حقیقت میں یہ کام حکومت کے کرنے کا تھا لیکن حکومتیں آتی اور جاتی رہیں مگر اس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ (ایضاً صفحہ)

ادب وثقافت کے نام پر

۱۹۵۴ء-۱۹۵۵ء کے مرکزی بجٹ سے، اسی شمارے میں بعض اعداد وشمار پیش کرتے ہوئے طلوع اسلام نے بتایا کہ کس طرح نام نہاد ادبی اور ثقافتی انجمنوں پر مرکزی خزانے کے لاکھوں روپے بے دریغ ضائع ہو رہے ہیں۔ ان اداروں اور متعلقہ عطایا کی تفصیل پیش کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

ان میں سے بعض ادارے تو ایسے ہیں جن کا شاید کسی نے نام تک بھی نہ سنا ہوگا۔ لیکن جن اداروں سے لوگ واقف ہیں ان میں مسلمانوں کے تمدن وثقافت، اقبال کے پیغام وتصور اور اسلام کی ریسرچ اور ری کنسٹرکشن کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، بعض گوشوں میں سرے سے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ اور جہاں کچھ ہو رہا ہے وہ ذہنی عیاشی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر اس غریب قوم کا یہی روپیہ، اس تصور کے عام کرنے میں صرف کیا جاتا جس کی بنا پر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا تو آپ دیکھتے کہ اس کے نتائج کس قدر تعمیری ہوسکتے۔ بدقسمت افراد کی طرح، بدقسمت اقوام کی بھی شومیٔ قسمت یہ نہیں ہوتی کہ ان کے ہاں پیسہ کی کمی ہوتی ہے۔ ان کی سوختہ بختی یہ ہوتی ہے کہ ان کا پیسہ صحیح مصرف میں خرچ نہیں ہوتا۔ ادب وثقافت وغیرہ ایوانِ ملت کی تزئین وآرائش کا سامان ہیں۔ اس کی بنیاد، دین کا وہ تصور ہے جس کی وحدت اور اشتراک کی بنا پر ہم ایک ملتِ واحدہ اور امت وسطیٰ بنتے ہیں۔ اگر کسی مکان کی بنیاد نیچے سے کھسک رہی ہو اور اہل خانہ مکان کی پینٹنگ میں مصروف ہوں تو ان کی اس عقلمندی کی داد کون دے گا؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس روپے

کو اس طرح ضائع ہونے سے بچایا جائے اور اسے اس تصور کے عام کرنے پر صرف کیا جائے جس پر پاکستان کی عمارت استوار ہے۔ اگر نیک نیتی سے اس کام کو ہاتھ میں لیا جائے تو بہت تھوڑے سے عرصہ میں یہاں ذہنی اور قلبی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ (ایضاً۔ صٹ)

قائدِاعظمؒ کے بعد

اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں طلوعِ اسلام نے "۱۴ اگست" کے عنوان سے پاکستان کی دس سالہ زندگی کا بھرپور جائزہ لیا اور حصولِ پاکستان کی فتحِ عظیم کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ بتایا کہ بانیٔ پاکستان کی وفات حسرت آیات کے بعد صورتِ حال کا نقشہ کس انداز سے بگڑ گیا۔ طلوعِ اسلام کی زبانی اس داستانِ غم کو سنئے۔

> قائدِاعظمؒ جو اس قوم کو ایک فرعون نہیں، متعدد فرعونوں کے چنگل سے نکال کر اس نئی دنیائے امن و سلامتی میں لے آئے تھے۔ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ چل بسے تو عجیب افراتفری کا دور شروع ہو گیا۔ اور اس گھر کی حالت بعینہٖ وہ ہو گئی جو ایک بزرگ کے اٹھ جانے کے بعد ناخلف اولاد کے ہاتھوں ہو جایا کرتی ہے۔ نام نہاد آزادی کی زندگی کو دیکھا جائے تو پاکستان قرونِ وسطیٰ کا وہ دربار نظر آتا ہے جیسے بادشاہ کے مرجانے کے بعد سازشوں کا جال بچھ گیا ہو۔ اقتدار کی اس کشمکش سے خانہ جنگی کی وہ صورت پیدا ہوئی کہ مقاصد کی تکمیل تو ایک طرف سرے سے مملکت کی برقراری مخدوش نظر آنے لگی۔ (شمارہ اگست ۵۵ء صٹ)

مُلّا کی پیش قدمی

اس آغاز کے بعد دستور سازی کے سلسلے کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

قائدینِ پاکستان مہماتِ امور سے ہٹ کر ذاتی اقتدار کے حصول میں منہمک ہو گئے۔ چنانچہ آزادی کے آٹھ سالوں میں ہمارے نام نہاد دستور سازوں نے مطلقاً یہ کوشش نہیں کی کہ اسلامی اصولوں کو مرتب و متشکل کریں تاکہ ان کے مطابق مملکت کا دستور تیار کیا جا سکے۔ ان کا ایسا کچھ از خود نہ کرنا ——— اس خیال سے قابلِ فہم تھا کہ وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے۔ لیکن جو چیز بالکل ناقابلِ فہم اور ہر طرح ناقابلِ معافی تھی وہ یہ تھی کہ انہوں نے اقبالؒ کے اس مکتبِ فکر سے ذرا بھر استفادہ کرنے کی کوشش نہ کی جو قرآنی اصولوں کی تشکیلِ نو میں مصروف تھا۔ جب آئین سازانِ پاکستان نے نورِ قرآنی کی تمام راہیں بند کر دیں تو رجعت پسندی، ذہنیاتِ سبیت اور جہالت کی تاریکی پھیلتی گئی۔ اس فضا میں ملّا آگے بڑھا اس نے مذہبی تقدس کا رعب دے کر لیڈروں کے عیب گنوائے اور خود مسندِ اقتدار کی طرف بڑھا۔ اسلام سے نابلد اور سیاسی ریشہ دوانیوں میں الجھے ہوئے اربابِ اقتدار ملّا کی پیش قدمی کو کہاں تک روک سکتے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۲ء میں جب بنیادی اصولوں سے متعلق کمیٹی کی سفارشات سامنے آئیں تو اس میں نہ محض سیاسی اعتبار سے ملّی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا گیا بلکہ قانون سازی کا آخری اختیار ملّا کے ہاتھ

میں دے دیا گیا۔ (ایضاً)

اس صورت حال سے جو اثرات مرتب ہوئے وہ بھی سن لیجئے۔

ارباب اقتدار نے (اس طرح) جدید فکری عوامل سے جو دست تعاون کھینچا تو مُلّا کے لئے میدان خالی ہو گیا۔ اس سے خود ارباب اقتدار کے لئے عجیب کشمکش پیدا ہو گئی۔ وہ مُلّا کے پیش کردہ تصور کو ناقابل عمل سمجھتے تھے لیکن اپنے آپ میں اتنی جرأت بھی نہیں پاتے تھے کہ اسے مسترد کر دیں۔ ان کی اس گومگو نے ملک کے نوجوان طبقہ کو ایک عجیب کشمکش میں مبتلا کر دیا ان کا ماڈرن ذہن مُلّائیت کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا لیکن مُلّائیت کو اسلام سمجھ کر وہ اسلام سے متنفر ہونے لگے ہیں۔ (ایضاً ص)

اس سلسلہ تفصیل کے بعد ہمارے سامنے صورت حال کے محرکات اور ان کا علاج آتا ہے۔ یہ طلوع اسلام کی تعمیری دعوت کا فطری تقاضا تھا۔ چنانچہ اس نے بتایا کہ

..... جائزہ لینے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانوں کے ضمیر میں کس قسم کا انقلاب پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ تحریک پاکستان نے مسلمانوں کے سطح شعور پہ ہلکا سا ارتعاش ضرور پیدا کر دیا تھا ... لیکن اس سطحی ارتعاش کو قلبی تموج اور ہیجان میں بدلنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ آئیڈیالوجی کے مطابق مملکت بنانے اور چلانے کے دعویداروں پر اولین فریضہ یہ عائد ہوتا تھا کہ وہ تعلیم پر اپنی توجہ صرف کرتے کہ اس سے مقاصد کا شعور پیدا ہوتا اور قوم میں اس شعور کے ساتھ متعین منزل کی جانب رواں دواں ہو جانے کے سامان پیدا ہوتے۔ لیکن تعلیم سے مجرمانہ غفلت برتی گئی۔ کہنے کو اسکولوں میں اضافہ ہوا۔ نئے کالج کھلے۔ یونیورسٹیاں قائم ہوئیں۔ لیکن تعلیمی نظام کو آئیڈیالوجی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ جب خود ان کا ذہن میں آئیڈیالوجی کا شعور مفقود تھا تو وہ تعلیمی نظام کو کیسے صحیح سمت میں رکھ سکتے تھے۔ اس بے مقصدی اور بے نظمی کے نتائج رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ (ایضاً۔ ص)

وزیر اعظم سے خطاب

ستمبر ۵۶ء کے مقالہ افتتاحیہ میں طلوع اسلام نے پاکستان کے وزیر اعظم محترم حسین شہید سہروردی کو پہلی بار براہ راست مخاطب کیا۔ وزیر اعظم موصوف کی خدمت میں اس نے سب سے پہلے دارالسلطنت کراچی میں برپا ہونے والے خطرات، حادثات، لوٹ کھسوٹ، بچوں کے اغوا، قتل و غارت گری، بے پردگی، بردہ فروشی اور عصمت دری کی تفاصیل پیش کیں اور لکھا۔

غور فرمایئے کہ جہاں زندگی اس شکل میں گزر رہی ہو، ان لوگوں کی قلبی کیفیت کیا ہو گی؟ ہمیں معلوم ہے کہ ان میں سے ہر جرم کے لئے قانون موجود ہے۔ پولیس موجود ہے۔ عدالتیں موجود ہیں لیکن اس کے

باوجود یہ روزمرہ کے واقعات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس مشینری میں کہیں کوئی سقم موجود ہے — بہت بڑا سقم — اس کی وجہ سے بدمعاشوں کے دل سے قانون کا ڈر اور شریفوں کے دل سے اس کا احترام جاتا رہا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس سرزمین میں قانون کا ڈر اور احترام باقی نہ رہے وہ سرزمین بے آئین ہو جایا کرتی ہے ہماری درخواست ہے کہ آپ ذاتی طور پر یہ دیکھیں کہ وہ سقم کہاں ہے اور اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔

(شمارہ ستمبر ۵۷ء۔ صفحہ)

اس کے بعد طلوع اسلام نے مختلف مزدیات زندگی سے متعلق عوام کی مشکلات کی وضاحت پیش کی۔ اور اسی سلسلے میں تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اول تو پچاس فی صد سے زیادہ طلبا کو داخلہ نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو تعلیمی اخراجات اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ انہیں برداشت نہیں کر سکتے۔ اور پھر ان ناقابل برداشت اخراجات سے عہدہ برا ہونے کے بعد جس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ —

جہاں تک اس کے نہج و اسلوب کا تعلق ہے، ہم اس دور میں پھر رہے ہیں جو انگریزوں کی غلامی کا تھا۔ نہ تعلیم کی بنیادی پالیسی میں کوئی فرق آیا ہے نہ نصاب میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی۔ اگر کہیں کوئی تبدیلی ہوئی ہے تو اس کے نتائج پہلے سے بدتر ہیں۔ تعلیم میں نہ اسلامی اقدار کا کوئی لحاظ رکھا جا رہا ہے۔ نہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کی کوئی رعایت۔ نہ مسلمانوں کے مخصوص تصورات حیات کا کوئی خیال ہے نہ ان کے نظریات زندگی کا کوئی تصور۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے نوجوان طبقہ کے ذہنوں میں انتشار خیالات میں پراگندگی۔ افکار میں بے راہ روی۔ نگاہوں میں بے باکی۔ اور قلوب میں سرکشی کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے ہیں۔ قوم کی درسگاہیں قوم کے بچوں کے صحیح تربیتی مراکز ہوتی ہیں۔ جن درسگاہوں کا یہ عالم ہو ان میں بچوں کی جس قسم کی تربیت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ ان کی تباہی و بربادی کے لئے یہی فتنہ کچھ کم نہ تھا کہ اس پر مغرب سے آنے والے فحش اور عریاں لٹریچر کے سیلاب کے سب بند کھول دیئے گئے۔ یہ ہے وہ قعر دریا جس میں ہم نے اپنے نوجوانوں کو تختہ بند کر رکھا ہے اور اس کے بعد کہا جاتا ہے کہ "دامن نہ ممکن ہشیار باش"! جس قوم کے نوجوانوں کی تربیت کا یہ عالم ہو اس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرنے کے لئے "الہام" کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ یہ چیز ہر نوجوان کی پیشانی پر لکھی ہوئی مل جائے گی۔ بس اس کے پڑھنے کے لئے بصارت کے بجائے بصیرت کی ضرورت ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ)

ملک جس پریشان کن بلکہ وحشتناک صورت حال کی زد میں تھا اس کا تفصیلی خاکہ پیش کرتے ہوئے طلوع اسلام نے وزیر اعظم پاکستان (حسین شہید سہروردی) کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ انہیں اس صورت حال کے ہولناک انجام سے خبردار کیا اور آخر میں لکھا —

ضرورت ہے۔ دیانت مقصد کے ساتھ اس مسئلہ کو ہاتھ میں لینے کی۔ اس کے لئے ضرورت ہے عزم راسخ اور ہمت بلند کی۔ ضرورت ہے جرأت اور بے باکی کی۔ ضرورت ہے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ترازوئے عدل کو ہاتھ میں لینے کی۔ اور ضرورت ہے چھوٹے اور بڑے اور غریب اور امیر کا امتیاز کئے بغیر تطبیق شدید اور گرفت محکم کی۔ اس سے ایسی فضا پیدا ہو سکتی ہے جس میں قانون شکنی کرنے والے کامل تنہائی میں خوف سے کانپ اٹھیں اور پرامن شریف انسان اطمینان کی نیند سو سکیں۔ جو حکومت ایسی فضا پیدا کر دے وہی کامیاب اور قابل فخر حکومت کہلا سکتی ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۸)

زندگی اور موت کا مسئلہ

پاکستان کی داخلی صورت حال کی اہمیت اور وزیر اعظم کے فرائض کی وضاحت کے بعد طلوع اسلام نے خارجہ پالیسی سے متعلق نہری پانی اور کشمیر کے مسائل کا ذکر چھیڑا اور اس کی اہمیت یوں واضح کی۔

کشمیر اور پانی کا سوال پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ملک اس قسم کی نازک کشمکش میں مبتلا ہو اس کے ارباب حل و عقد اور اصحاب دانش و بینش پر راتوں کی نیند حرام دن کا چین حرام ہو جانا چاہیئے اور انہیں تمام جزئی امور ایک طرف رکھ کر کلی یک جہتی اور یک رنگی سے اس مشکل کے حل کی جستجو میں اپنا پسینہ ایک کر دینا چاہیئے۔ لیکن ہمارے ہاں اس کے برعکس جو کچھ ہو رہا ہے اس کی زندہ شہادت ہماری بساط سیاست اور اس کی مہرہ بازیاں ہیں۔ اس بساط پر گذشتہ دو تین برس سے جو کچھ ہو رہا ہے (اور جس کی رفتار گذشتہ ایک سال سے اور بھی تیز ہو گئی ہے) اس سے صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے زعماء کرام اور لیڈران عظام کو نہ کشمیر کی فکر ہے اور نہ نہروں کے پانی سے کچھ دلچسپی۔ انہیں دلچسپی ہے تو فقط اپنی ذات سے۔ ان کے پیش نظر ہیں تو صرف اپنے مفاد اور ہوس اقتدار کی تسکین وہ سب ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی کا راز سمجھتے ہیں۔

(شمارہ ستمبر ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۴)

علاج کیا ہے؟

یہ تو تھی مسئلہ کی اہمیت اور ہمارے ارباب اقتدار کی بے حسی اور مفاد پرستیوں کی کیفیت اس کی وجہ کیا تھی اور اس کا حل کیا ہو سکتا ہے؟ طلوع اسلام نے اس اہم سوال کا جواب دیا اس نے لکھا۔

اس کی وجہ بالکل واضح اور بیّن ہے یعنی سیرت کی کمزوری۔ کیریکٹر کا فقدان۔ اور اس کا علاج؟ یہی وہ مقام ہے جہاں ہم میں سے ہر ایک خاموش ہو جاتا ہے اور کسی کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کہ ابھی دنیا میں کوئی ایسا انجکشن ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کے دل میں کیریکٹر داخل کر دیا جائے۔ کیریکٹر پیدا ہوتا ہے

صحیح تعلیم اور مناسب تربیت سے اور تعلیم و تربیت کا انتظام آپ آنے والی نسل کے لئے تو کر سکتے ہیں، طفلانِ کہن سال کیلئے نہیں کر سکتے۔ ان کا علاج صرف قانون کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کشمکش کے ختم کرنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ہم اپنے آئین میں اس قسم کی تبدیلی کریں جس سے وزیرِ اعظم اور صوبے کے چیف منسٹروں کا انتخاب براہ راست ہو اور جو امیدوار منتخب ہوں وہ (صدرِ مملکت کی طرح) آئندہ انتخاب تک اپنی اپنی کرسی پر متمکن رہیں۔ انہیں وہاں سے ہٹانا ہو تو اس کے لئے وہی طریق اختیار کیا جائے جو صدرِ مملکت کے لئے آئین میں رکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ الیکشن میں جو ممبر کسی پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے اگر وہ پارٹی چھوڑ دے تو اسے رکنیت سے الگ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ ہم ان تبدیلیوں کی تجویز ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر کر رہے ہیں ورنہ ہمارے نزدیک تو پارٹیوں کا وجود ہی ہلاکت انگیز ہے۔ (ایضاً۔ صہ)

اختلاف و افتراق کے شعلے

اب طلوعِ اسلام بابت اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء کے "لمعات" ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اپنے اس افتتاحیہ میں طلوعِ اسلام ان تمام سیاسی و مذہبی تفرقہ بازیوں کا بھرپور محاسبہ کرتا ہے جن کی وجہ سے وحدتِ ملت پارہ پارہ ہوئی جا رہی تھی اور چاروں طرف ایک طوفان بدتمیزی بپا تھا۔ چنانچہ افتراق و انتشار کی ان تمام سازشوں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

پاکستان بن گیا لیکن اس کے ساتھ ہی چشمِ فلک نے یہ عجیب تماشہ بھی دیکھا کہ وہی اربابِ لبست و کشاد جو واہگہ کی سرحد تک امتِ واحدہ کے نعرے بلند کرتے چلے آ رہے تھے سرزمینِ پاکستان میں قدم رکھتے ہی اختلاف و افتراق کی سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ ہمارے ہاں مذہبی فرقے تو پہلے سے موجود تھے۔ پاکستان پہنچ کر سیاسی تفرقوں نے انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی بیان سرحدی۔ پنجابی۔ سندھی۔ بلوچی۔ بنگالی اور غیر بنگالی کے مذموم اور بیکر غیر اسلامی جذبات کو ہوا دیا جانے لگا۔ اس شعلہ جنگی کو سب سے زیادہ ہوا اس منحوس اور تباہ کن فیصلے نے دی جس کی رو سے ملازمتوں وغیرہ میں صوبائی تناسب قائم کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ آگ اس قدر تیز اور اس کے شعلے اتنے بلند ہو گئے کہ خود پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ گئی۔ (شمارہ اکتوبر سنہ ۵۸ء صہ ۲۱)

لمعات کے اختتام پر اس نے خون کے آنسو قلم کی نوک پر لاتے ہوئے یہ لکھا۔

سوال یہ ہے کہ ملک میں تشتت اور انتشار کے جو شعلے اس وقت بھڑک رہے ہیں ان کا مداوا کیا ہے؟ اگر ہم جذبات سے الگ ہٹ کر سوچیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ گزشتہ دس سال کے تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اگر زمامِ حکومت نا اہلوں اور بے کرداروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو مملکت

کا کیا حشر ہو جاتا ہے۔ اس تجربے سے اب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خود ارباب حکومت ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو رہے ہیں۔ ایک ہی پارٹی کا ایک لیڈر کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ۔ ایک ہی کیبنٹ کا ایک وزیر ایک طرف کو جاتا ہے دوسرا دوسری طرف کو۔ وزیر اعظم کچھ کہتا ہے اور اس کے وزرا کچھ اور۔ مرکز سے ایک حکم نافذ ہوتا ہے اور صوبے کا چیف منسٹر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس صورتِ حالات کو کچھ عرصے کے لئے اسی طرح رہنے دیا گیا تو حکومت کی مشینری میں انار کی پھیل جائے گی۔ لہٰذا حالات ہمیں خود بخود اس منزل کی طرف لے آئے ہیں جہاں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ اس "جمہوری تماشے" کو ختم کر کے ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا جائے اور نظم و نسق کو فوج کے مستحکم ہاتھوں میں دے دیا جائے تاکہ انتخابات پُر امن اور منظم فضا میں تکمیل تک پہنچ سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ اگر انتخابات کے لئے فضا پر امن ہو گئی تو ہمارے عوام ان لیڈروں میں سے کسی کو ووٹ نہیں دیں گے جنہوں نے ملک کو اس حالت تک پہنچا دیا ہے۔ ہمارے نزدیک ملک کے موجودہ حالات پر قابو پانے کے لئے اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں۔

(ایضاً)

اربابِ سیاست کی مفاد پرستیاں

ملک کے سیاسی حالات بد تر ہوتے جا رہے تھے۔ سیاسی لیڈروں کی ہوس اقتدار نے چاروں طرف انتشار کے خیمے پھیلا رکھے تھے۔ محلاتی سازشوں کا دور دورہ تھا۔ سیاسی وفاداریوں کے مرکز تبدیل کرنے میں ادنیٰ جھجک یا شرم محسوس نہیں کی جا رہی تھی — طلوعِ اسلام کے لئے ایسی صورتِ حال سے صرفِ نظر کیونکر ممکن تھا چنانچہ جنوری ۱۹۵۸ء کے مقالہ افتتاحیہ میں اس نے ایک بار پھر قوم کو اس کے ان سیاسی مداریوں اور ان کی ہنگامہ خیزیوں کے انجام سے یوں خبردار کیا۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم نے ملت کی محکم اور پائیدار کشتی کو اس بُری طرح ذاتی مفاد پرستیوں اور اقتدار پسندیوں کی تلاطم انگیز موجوں کے سپرد کیا ہے کہ کشاکشِ پیہم سے اس کا بند بند ڈھیلا ہو چکا ہے اور تار تار ہونا توان بیٹھا ہے کہ نہ معلوم کب اس کے تختے الگ ہو جائیں۔ کشتی کے مسافروں کی یہ حالت ہے اور ناخدایانِ کشتی اس رسہ کشی میں مصروف ہیں کہ امیر البحر کون بنے اور قیادت کا منصب کس کے ہاتھ میں آئے۔ یوں تو یہ کشتی ایک عرصے سے حوالۂ گرداب تھی۔ لیکن گزشتہ دو تین ماہ سے اسے جن امواجِ بلا کا سامنا کرنا پڑا انہوں نے تمام سابقہ طوفان انگیزیوں کو بھلا دیا۔

(طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۵۸ء صفحہ ۲)

صورتِ حال کے مضمرات کو قوم کی نگاہوں کے سامنے لاتے ہوئے اس نے جو تجزیہ کیا وہ یہ تھا کہ مسٹر سہروردی کی وزارت ٹوٹنے کے بعد منصب ناخدائی مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی شراکت

کے حصے میں آیا..... اور ابھی اسٹیج پوری طرح سجائی بھی نہیں گئی تھی کہ پردہ اٹھ گیا۔ اور دنیا بھر نے یہ تماشا دیکھا کہ یہ اکابرینِ ملت بچوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ اس تماشے میں سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ جنگ تو تھی یہ خالص اقتدار پرستی کی، لیکن لڑی جا رہی تھی اصول پرستی اور اسلام دوستی کی سپر کے پیچھے۔ اس باب میں مسلم لیگ کی پوزیشن سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ یہ حقیقت اب کسی دلیل اور شہادت کی محتاج نہیں کہ مسلم لیگ کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ تحریکِ پاکستان کے مزار کی متولی ہے۔ اس کے اپنے اندر کوئی خوبی نہیں ہے۔ اس کے پاس اپنی ہستی اور بقا کی کوئی سند ہے تو فقط اتنی کہ جس مزار کی جاروب کشی کی خدمت اس کے سپرد ہے وہ بڑی باعظمت اور باتوقیر ہے (ایضاً)

چند سطور آگے بڑھ کر ہمارے ان کارفرمایانِ سیاست کے چہروں سے کچھ اور نقاب سرکتا ہے اور مزید ایک "تلخ حقیقت" سامنے آتی ہے۔ طلوعِ اسلام کے الفاظ میں سنئے۔

حقیقت یہ ہے (اور کس قدر تلخ حقیقت) کہ ہمارے ہاں اسلام کا تصور، پاکستان کا بنیادی تخیل، آئیڈیالوجی کا تحفظ، مملکت کا استحکام، اہلِ پاکستان کی بہبود سب جال ہیں جنہیں ملک کی مختلف پارٹیوں کے شکاری اپنے اپنے کندھوں پر لئے پھرتے ہیں...

ہمارے ہاں ہو یہ رہا ہے کہ جب تک کوئی شخص تختِ وزارت یا کرسیٔ حکومت پر متمکن رہتا ہے، پاکستان میں ہر طرح خیریت ہوتی ہے۔ ان کی ہر تقریر اور ہر بیان سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان زندگی کے ہر شعبہ میں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب اقوامِ عالم کی قیادت اس کے حصے میں آجائے گی۔ لیکن جونہی یہ حضرت وزارت یا حکومت سے الگ کر دئیے جاتے ہیں ان کا پہلا بیان یہ ہوتا ہے کہ ملک میں چاروں طرف تباہی اور بربادی پھیل چکی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہم قعرِ مذلت میں نہیں گر چکے اگر کچھ دنوں تک یہی حالت رہی تو.....

اس مرثیہ کے بعد مقطع کا بند یہی ہوتا ہے کہ اس تباہی سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ مجھے پھر اسی کرسی پر بٹھا دو جہاں سے مجھے اتارا ہے۔ (ایضاً - ص۱۴۳)

عوام کے ساتھ زیادتی

۱۹۵۸ء کا آغاز ملک کے آئندہ عام انتخابات کی تیاری کر رہا تھا لیکن جہاں تک ملک کے عوام کا تعلق ہے ان پر ایک مایوسی کی سی کیفیت طاری تھی۔ چنانچہ جب ووٹ دہندگان کی ابتدائی فہرستیں شائع ہوئیں تو عوام نے ان سے کوئی خاص دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ طلوعِ اسلام نے گہری نظر سے قوم کی اس نفسیاتی کیفیت کا جائزہ لیا اور مایوسی کی اس کیفیت پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے جون ۱۹۵۸ء کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا۔

ان حالات کا رونا کیا۔ یہ تو قصداً اور ارادتاً پیدا کئے گئے ہیں۔ گزشتہ دس سال سے ہمارے رہنمایانِ قوم اور سربرآوردگانِ مملکت کی یہ مسلسل کوشش رہی ہے کہ عوام کو ایسا شکستہ خاطر اور بددل کر دیا جائے کہ انہیں کاروبارِ مملکت سے کوئی دلچسپی نہ رہے اور اس طرح یہ ڈیما کریسی (عوام کی حکومت) کے نمائندے عوام کی طرف سے یکسر بے تعلق، بلکہ ان کی طرف سے مامون و مصئون ہو کر اپنی آمریت قائم رکھ سکیں۔ ان کی یہ کوششیں بڑی کامیاب رہی ہیں اس لئے آئندہ الیکشن ان کے لئے کوئی خطرہ پیدا نہیں کر سکتا۔ الیکشن کی سرگرمی مختلف پارٹیوں کی باہمی رسہ کشی (یا ٹنگ زدگری) ہے۔ اپنے حسنِ کارکردگی کی بنا پر عوام کی نمائندگی حاصل کرنے کی جدوجہد نہیں۔

(لمعات۔ شمارہ جون ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۳)

مارشل لاء اور ہنگامی تدابیر

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے آخری ایام تھے۔ جب کہ ملکی صورت حال نے زبردست پلٹا کھایا اور سیاسی انتشار کے بگڑے ہوئے ماحول میں مارشل لاء کے فوجی انقلاب نے اپنی کارفرمائی کا اعلان کر دیا۔ ہر قسم کے سماج دشمن عناصر کی سرکوبی پوری شدت سے شروع ہو گئی اور ان زبانوں پر جو آئے دن آگ کے شعلے برسایا کرتی سکوت کی مہریں لگ گئیں۔ فوجی انقلاب کے اس دور میں بھی طلوع اسلام نے اپنی دعوتِ فکر کو برابر جاری رکھا۔ اس نے فوجی حکومت کے اصلاحی اور تعمیری کارناموں کی تائید کی اور دسمبر ۱۹۵۸ء کے لمعات میں اس کی تائید کے ساتھ ساتھ سب کو قومی نفسیات کی ایک اہم حقیقت سے یوں خبردار کیا۔

یہ سب ہنگامی تدابیر ہیں جن سے ملک اور قوم، وقتی طور پر ان درندوں کی سبعیت و بربریت سے محفوظ ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ ان بلاؤں سے مستقل طور پر بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ وہ کون سا طریق ہے جس سے قوم ان بھیڑیوں کی ہوسِ خون آشامی سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مصئون ہو جائے۔ وہ کون سی ذوالقرنینی دیوار ہے جو اس قسم کے "یاجوج و ماجوج" کی روک تھام کا ایسا انتظام کر دے کہ ان کی یورش کے لئے کوئی شگاف باقی نہ رہے۔ اس قسم کی آہنی دیوار کا فارمولا قرآن سے ملتا ہے۔ اگر اس کے مطابق عمل کر لیا جائے تو پھر انسانیت کے لئے اس سیلابِ بلا کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ (لمعات۔ شمارہ دسمبر ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۳)

اس کے بعد طلوع اسلام۔ قرآن کی روشنی میں، ان تمام مقاصد کا حل تفصیلاً پیش کرتا ہے اور پھر فوجی انقلاب کے کارفرماؤں پر یہ واضح کرتا ہے کہ

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ قرآنی نظام ایسا نہیں جو صرف رعایا پر نافذ ہو اور حکومت پر نافذ نہ ہو۔ (ہم نے حکومت اور رعایا کے الفاظ محض سمجھانے کی خاطر استعمال کئے ہیں) یہ

کلی نظام ہے جو حکومت اور رعایا سب پر یکساں طور پر نافذ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو حکومت خود قرآنی اصولوں کے مطابق ہو، وہی قرآنی نظام نافذ کر سکتی ہے۔ قرآن نے جو کچھ عوام پر واجب قرار دیا ہے اسے وہی حکومت وصول کر سکتی ہے جو ان ذمہ داریوں کو پورا کرے جو قرآن نے مملکت پر عائد کی ہیں۔

ایک اہم حقیقت اور پھر وہ بتاتا ہے کہ اس قسم کی حکومت، قرآنی نظام کو ڈنڈے کے زور پر نہیں چلائے گی بلکہ عوام میں ایسا اجتماعی شعور پیدا کرے گی جس کی بدولت افراد معاشرہ بطیب خاطر اس نظام کے تقاضوں کو پورا کریں گے۔ طلوع اسلام کے اپنے الفاظ میں سنیئے۔

اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآنی نظام اپنی حقیقی روح کے مطابق اسی صورت میں نافذ اور نتیجہ خیز ہوگا جب اس کے تقاضے دل کی گہرائیوں سے ابھریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کریں جس سے ہمارے نوجوانوں کا قلب و دماغ قرآن کے قالب میں ڈھل جائے (اقتباس ختم)

ہر قسم کی مل کی ضروریات کے لئے

آپ

ابروز مل سٹور نکل روڈ کراچی

کی طرف رجوع کریں